تعلیم و تربیت

جولائی 1995ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلام علیکم

چلچلاتی دھوپ میں گاڑی سے اُترے۔ گاڑی سے دفتر تک کا فاصلہ دو ڈھائی منٹ کا ہو گا۔ لیکن اتنے مختصر عرصے ہی میں پسینے میں نہا گئے۔ دفتر میں داخل ہو کر ٹیوب لائٹیں روشن کیں، اے سی آن کیا۔ دو منٹ میں کمرا ٹھنڈا یخ ہوگیا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کراچی سے کال تھی۔ معلوم ہوا، مولوی عبدُالقدّوس صاحب کراچی سے، بذریعہ ایئر بس، روانہ ہوگئے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد انہیں لاہور ایئرپورٹ سے لے لیں۔

"اوکے" کہہ کر ریسیور رکھا۔ ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کیا۔ بی بی سی ورلڈ سروس سے خبریں ہو رہی تھیں۔ پانچ منٹ میں معلوم ہوگیا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

اسی دوران میں، فیکس مشین کی گھنٹی بجی۔ لندن سے پیغام آیا تھا کہ سُہیل احمد صاحب کا خراب گُردہ نکال کر صحّت مند گردہ لگا دیا گیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔

یہ بہکی بہکی باتیں نہیں ہیں (جیسا کہ آپ سوچ رہے ہوں گے)۔ ہم نے جدید سائنس کی اُن سینکڑوں برکتوں میں سے چند برکتیں گنوائی ہیں، جن سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جب ہم سائنس کی عطا کی ہوئی اِن سہولتوں اور آسائشوں کو استعمال کرتے ہیں تو ہمارے دل سے، بے اختیار، ان سائنس دانوں کے لئے کلمۂ خیر نکلتا ہے، جن کی ذہانت اور محنت کے طفیل ہمیں یہ سہولتیں نصیب ہوئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوچ کر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ سائنس دانوں کی اس لمبی چوڑی فہرست میں ہمارے کسی ہم وطن کا نام نہیں۔

5 سال بعد اِکیسویں صدی شروع ہو رہی ہے۔ یہ صدی، سائنسی ایجادات کے لحاظ سے، بیسویں صدی سے کہیں زیادہ اہم ہوگی۔ اگر ہم نے بیسویں صدی میں، سائنسی میدان میں، کوئی کارنامہ نہیں کیا تو اِکیسویں صدی میں تو کچھ کر کے دکھائیں۔ آپ میں سے جن ساتھیوں نے سائنس لی ہے، اُن کے لئے یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے، اور یہ چیلنج انہیں قبول کرنا ہے۔

اڈیٹر

اس شمارے میں

اداریہ		1
برسات کی بہاریں (نظم)	حفیظ الرحمٰن احسن	2
چھتری مت کھولنا (کہانی)	سعید لخت	3
ٹھگ (کہانی)	محمد یونس حسرت	5
ہیرو نمبر ایک (کہانی)	سید نظر زیدی	10
صندوقچی کا راز (کہانی)	فوزیہ طاہرہ	14
درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	19
شہری چڑیا	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	20
نان بائی کی ڈاڑھی (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	22
گرمیوں کی چھٹیاں (نظم)	محمد انوار احمد	26
انگوٹھی کہاں گئی (کہانی)	محیط اسمٰعیل	27
جنگ (مضمون)	س۔ل	31
بلا عنوان (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	33
آیئے مسکرائیں (لطیفے)		36
جرم اور سزا (کہانی)	سلیم خان گمی	37
دل چسپ اور عجیب	س۔ل	44
علمی آزمائش		46
باتیں بڑوں کی		47
آپ بھی لکھئے		49
آپ کا خط ملا		54
بلو، تم خفا کیوں ہو؟ (نظم)	عبدالحفیظ ظفر	57
جگ مگاتی راہ (کہانی)	احفاظ الرحمان	58
کمرچھ (مضمون)	س۔ل	62
فرصت کے کھیل		64

...واں سال
...وتھا شمارہ
...یم و تربیت
...ے زیادہ پڑھا جانے والا
...حبوب رسالہ
عبدالسلام
سعید لخت
...یٹر: رضوان ثاقب
...ٹنگ سید شوکت العجاز
...نٹ محمد بشیر راہی
...ز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
ظہیر سلام
عبدالسلام
پتا
...ہ تعلیم و تربیت
...شارع بن بادیس لاہور
6361309-6361310
6278815-6278816
...رکولیشن اور اکاؤنٹس
...شاہراہ قائدِ اعظمؒ لاہور
سالانہ قیمت
...صرف رجسٹری کے ساتھ /-250 روپے
...فریقہ (ہوائی ڈاک سے) /-475 روپے
...ائی ڈاک سے) /-675 روپے
...بعید (ہوائی ڈاک سے) /-695 روپے
...جولائی 1995
قیمت فی پرچہ /-12 روپے

حفیظ الرحمٰن احسن

برسات کی بہاریں

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، پیغام لا رہے ہیں
اور بادلوں کے ٹکڑے، کچھ گُن گُنا رہے ہیں
کچھ پاس آ رہے ہیں، کچھ دُور جا رہے ہیں
لو، ننھّی بُوندیوں کی، پڑنے لگیں پھُواریں
دل کو لُبھا رہی ہیں، برسات کی بہاریں

لو، آگئی وہ بارش، برسا وہ مینہ چھما چھم
ہونے لگی چھتوں پر، اولوں کی بھی دھما دھم
اور مینڈکوں نے مِل کر، کیسا مچایا اُودھم
سب لڑکے بالے مِل کر، خوش ہو کے یہ پُکاریں
"کیا گیت گا رہی ہیں، برسات کی بہاریں"

نعمت ہے اِک خدا کی، برسات کا زمانہ
پانی سے چل رہا ہے، قُدرت کا کارخانہ
ہر چیز میں چُھپا ہے، فِطرت کا اِک خزانہ
پھل، پھول، سبزہ سب ہیں، بارش کی یادگاریں
دنیا پہ چھا رہی ہیں، برسات کی بہاریں

چھتری مت کھولنا

سعید لخت

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار کوئی اِکّا دُکّا بوند بھی پڑ جاتی۔ گگوّ میاں گھبرائے ہوئے کمرے میں آئے اور امّی سے بولے:

"امّی، امّی، میری چھتری کہاں ہے؟ برآمدے میں رکھی تھی۔"

امّی بولیں "بیٹے، چھتری تو فریدہ لے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، شکیلہ کے گھر جا رہی ہوں۔"

گگوّ میاں اُچھل کر بولے "ہائے! غضب! اب کیا ہوگا؟ وہ چھتری کھولے گی تو تو میں جاکر اُسے پکڑتا ہوں۔ ابھی راستے ہی میں ہوگی۔"

امّی روکتی ہی رہ گئیں، اور گگوّ میاں گھر سے نکل، یہ جا اور وہ جا۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ ڈاکیا ملا۔ گگوّ میاں رُک گئے اور بولے "کیوں حاجی صاحب، آپ نے میری بہن فرد کو دیکھا ہے؟ ابھی ابھی اِدھر کو گئی ہے۔"

ڈاکیا بولا "ارے میاں برخوردار، یہ کہاں کی تمیز ہے؟ نہ سلام، نہ دُعا، جھٹ سے سوال کر دیا۔"

گگوّ میاں بولے "السّلامُ علیکُم، السّلامُ علیکُم۔ اب یہ بتائیے کہ آپ نے میری بہن فرد کو دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو کیا اُس کے ہاتھ میں چھتری تھی؟ اگر تھی تو کُھلی ہوئی تھی یا بند تھی؟"

ڈاکیے نے کہا "ارے رے رے۔ تم نے تو ایک ہی سانس میں اِتنی ساری باتیں پُوچھ ڈالیں۔ خیر تو ہے؟ اِتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

گگوّ میاں بولے "یہ پھر بتاؤں گا۔ پہلے آپ میری باتوں کا جواب دیجئے۔"

ڈاکیے نے کہا "فریدہ بی بی کو میں نے ابھی ابھی اُدھر جاتے دیکھا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں چھتری تھی، اور وہ بند تھی۔"

"شکریہ، بہت بہت شکریہ" گگوّ میاں نے کہا اور بگ ٹُٹ بھاگے۔ سڑک کے پار ایک گلی تھی۔ گلی کے نکڑ پر خیر دین کُنجڑے کی دُکان تھی۔ خیر دین نے گگوّ میاں کو دیکھا تو آواز دی "ارے میاں کہاں بھاگے جا رہے ہو؟"

گگوّ میاں نے پھولی ہوئی سانس دُرست کی اور پھر

بولے "خیر دین بھائی۔ یہ بتایئے، آپ نے میری بہن فرو کو دیکھا ہے؟"

"ہاں، ہاں" خیر دین بولا "ابھی، تھوڑی دیر ہوئی، وہ مجھ سے ایک رُوپے کی گاجریں لے گئی ہیں۔ کہتی تھیں، شکیلہ کے گھر جارہی ہوں۔"

"شکریہ، شکریہ" گگو میاں بولے "اچھا، اب یہ بتایئے کہ اُن کے ہاتھ میں چھتری تھی؟ اگر تھی تو کُھلی ہوئی تھی یا بند تھی؟"

خیر دین نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولا "کچھ یاد نہیں آرہا۔ پتا نہیں بند تھی یا کھلی ہوئی تھی۔"

گگو میاں نے خیر دین کو سلام کیا اور گلی میں گھس گئے۔

ایکا ایکی، ایک سائیکل سوار آیا اور گگو میاں کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ یہ گگو میاں کے خالو جان تھے۔ اُنہوں نے پُوچھا "ارے بھئی گگو میاں، کہاں بھاگے جارہے ہو؟ خیریّت تو ہے؟"

گگو میاں بولے "سب خیریّت ہے۔ ابّا جان بھی خیریّت سے ہیں۔ امّی جان بھی خیریّت سے ہیں۔ میں بھی خیریّت سے ہوں۔ فریدہ کا پتا نہیں۔ وہ مجھے ملتی ہی نہیں۔"

خالو جان بولے "فریدہ تو ابھی ابھی مجھے ملی تھی۔ شکیلہ کے گھر جارہی تھی۔"

"اچھا" گگو میاں اُچھل کر بولے "یہ بتایئے کہ اُس کے ہاتھ میں چھتری تھی؟ اگر تھی تو کُھلی ہوئی تھی یا بند تھی؟"

خالو جان نے کہا "اُس کے ہاتھ میں چھتری تھی، اور وہ شاید ـــــ بند تھی۔ لیکن بات کیا ہے؟"

"یہ پھر بتاؤں گا۔ اِس وقت مجھے ذرا جلدی ہے۔ سلام علیکُم" گگو میاں نے کہا اور پھر دوڑ لگا دی۔

اُس گلی میں ایک اور گلی تھی، اور اُس گلی کے آخر میں شکیلہ کا گھر تھا۔

گگو میاں گلی میں گھُسے ہی تھے کہ فریدہ دکھائی دی۔ وہ شکیلہ کے گھر کے دروازے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ـــــ

گگو میاں نے زور سے کہا "فرو! فرو! چھتری مت کھولنا۔ چھتری مت کھولنا۔"

فریدہ ٹھہر گئی، اور حیرت سے گگو میاں کو دیکھنے لگی۔ گگو میاں بھاگتے ہوئے اُس کے پاس پہنچے، اور ہانپتے ہوئے بولے "ہائے! اُف! تم نے راستے میں چھتری کھولی تو نہیں تھی؟"

"نہیں تو" فریدہ نے کہا "کیوں؟ کیا بات ہے؟"

گگو میاں بولے "چھتری میں بِل ـــــ بِل ـــــ بُلونگڑا ہے، بِلّی کا بچّہ!"

"بِلّی کا بچّہ؟" فریدہ نے حیرت سے کہا، اور چھتری کھولی تو سچ مُچ بِلّی کا ایک ننھّا مُنّا، گول مٹول سا، بچّہ کُود کر باہر نکلا اور گگو میاں کی ٹانگوں سے چمٹ کر خرخر کرنے لگا۔

فریدہ بولی "میں بھی تو کہوں کہ چھتری اِتنی بھاری کیوں ہے۔ مگر یہ چھتری میں گھُسا کیسے؟"

گگو میاں بولے "میں نے رکھا تھا اِسے چھتری کے اندر۔ کچھ دن پہلے سفید بِلّی نے، چھت پر، بچّے دیے تھے۔ دوسرے بچّے تو وہ کہیں لے گئی، یہ بے چارہ وہیں رہ گیا۔ اِسے ایک موٹا سا بلّا مار رہا تھا۔ میں نے بڑی مُشکل سے بچایا، اور پھر چھتری میں چُھپا دیا۔ جب اِس کی ماں آئے گی تو اُسے دے دُوں گا۔"

فریدہ ہنس کر بولی "یہ بھی خوب رہی۔ اِسے اندر لے چلو۔ دودھ پلائیں گے۔ بھوکا ہے بے چارہ۔"

محمد یونس حسرت

ٹھگ
کالی دیوی کے پجاری

یہ آج سے 200 سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہندوستان کے صوبہ یوپی میں ایک جنگل کے پاس سے ایک قافلہ گزر رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کردیا۔ ڈاکو لوگوں کو مارتے پیٹتے اور لوٹتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ قافلے کے ایک شخص کے پاس اور سامان کے عِلاوہ اشرفیوں کی ایک تھیلی بھی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں اشرفیوں کی اِس تھیلی کو جنگل میں کسی جگہ چھپا دوں۔ باقی سامان لُٹ جائے تو لُٹ جائے۔ کم از کم یہ تھیلی تو بچ جائے گی۔

یہ ارادہ کرکے اس نے اپنے سامان کو قافلے ہی میں چھوڑا اور اشرفیوں کی تھیلی بغل میں دبائے ڈاکوؤں سے بچتا بچاتا، قافلے سے نکل آیا۔ قافلے سے باہر آکر اس نے جنگل کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک خیمہ دکھائی دیا۔ اس خیمے کے اندر ایک شخص چٹائی پر بیٹھا عبادت کررہا تھا۔ مسافر نے خیال کیا کہ یہ اللہ کا نیک بندہ معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے میں اشرفیوں کی تھیلی اِس کے سپرد کردوں۔ بعد میں اِس سے لے لوں گا۔ یہ سوچ کر وہ اُس شخص کے پاس گیا اور کہا کہ جناب، میرے قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کردیا ہے اور وہ لوٹ مار کررہے ہیں۔ آپ میری یہ اشرفیوں کی تھیلی بطور امانت اپنے پاس رکھ لیں۔ میں بعد میں آپ سے لے لوں گا۔

مسافر کی یہ بات سُن کر اس شخص نے زبان سے کچھ نہیں کہا، ہاتھ سے اشارہ کیا کہ خیمے میں رکھ دے۔ مسافر اشرفیوں کی تھیلی خیمے میں رکھ کر قافلے میں واپس گیا تو ڈاکو قافلے والوں کو لوٹ کر جاچکے تھے۔ اس کے سامان سے بھی کچھ چیزیں ڈاکو لے گئے تھے اور باقی چیزیں وہیں پڑی تھیں۔ اس نے وہ چیزیں اٹھائیں اور پھر اُس خیمے کی طرف گیا تاکہ اپنی امانت واپس حاصل کرسکے۔ مگر جب وہ خیمے کے نزدیک پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سارے ڈاکو اس شخص کے سامنے جمع ہیں اور لوٹ کے مال کا ڈھیر اس کے سامنے لگا رہے ہیں۔ وہ شخص اس لوٹ کے مال میں سے اپنا حصّہ الگ رکھ کر باقی مال ان ڈاکوؤں میں تقسیم کررہا تھا۔ تب اس مسافر کو معلوم ہوا کہ یہ شخص اصل میں اِن ڈاکوؤں کا سردار ہے۔ وہ دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ میں نے تو خود اپنے ہاتھ سے اشرفیوں کی تھیلی ڈاکوؤں کے اس سردار کو تھمادی۔ اب وہ مجھے کیا ملے گی؟

یہ واقعہ اُن سینکڑوں ہزاروں واقعات میں سے ایک ہے جو پُرانے زمانے میں سفر کرنے والوں کو پیش آتے تھے۔

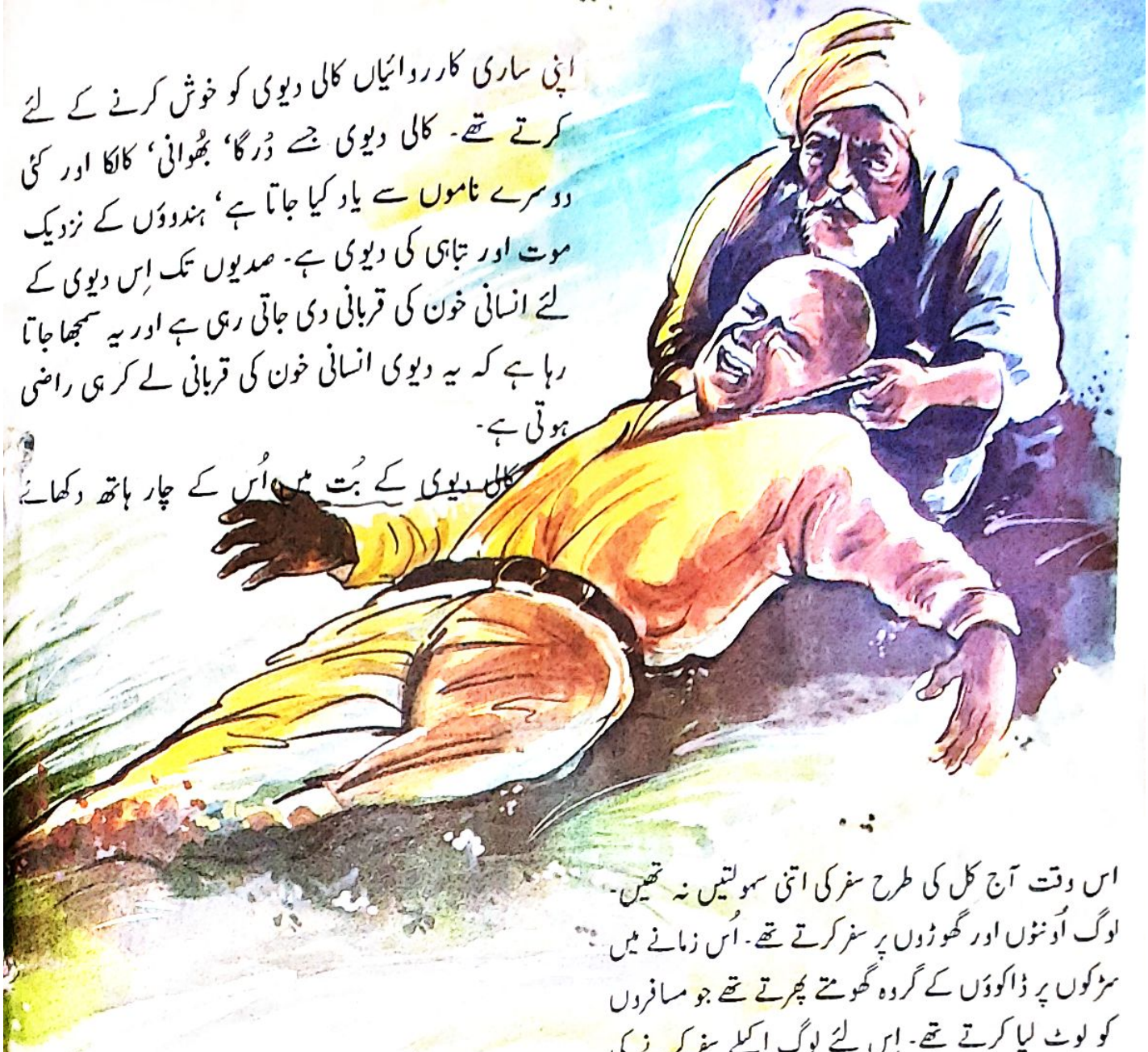

اپنی ساری کارروائیاں کالی دیوی کو خوش کرنے کے لئے کرتے تھے۔ کالی دیوی جسے دُرگا، بھوانی، کالکا اور کئی دوسرے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ہندوؤں کے نزدیک موت اور تباہی کی دیوی ہے۔ صدیوں تک اِس دیوی کے لئے انسانی خون کی قربانی دی جاتی رہی ہے اور یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ یہ دیوی انسانی خون کی قربانی لے کر ہی راضی ہوتی ہے۔

کالی دیوی کے بُت میں اُس کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں خون آلود تلوار ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں ایک کٹا ہُوا اِنسانی سر جس سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہوتے ہیں۔ اُس کے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار ہوتا ہے اور اس کے کانوں میں انسانی اَعضا سے بنے ہوئے آویزے لٹک رہے ہوتے ہیں۔

ٹھگوں کا یہ گروہ جو صدیوں تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سرگرم رہا، اِسی کالی دیوی کے پُجاریوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ جتھّے بناکر مختلف علاقوں میں گھومتے تھے۔ ہر جتھّے کا ایک لیڈر ہوتا تھا جس کی قیادت میں لوٹ مار اور قتل کی کارروائی خفیہ طریقے سے انجام دی جاتی تھی۔ ان ٹھگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ جتنا زیادہ انسانی خون بہائیں گے، اتنا ہی کالی دیوی ان سے خوش ہوگی۔ چناں چہ وہ اپنی ہر

اس وقت آج کل کی طرح سفر کی اتنی سہولتیں نہ تھیں۔ لوگ اُونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سڑکوں پر ڈاکوؤں کے گروہ گھومتے پھرتے تھے جو مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اِس لئے لوگ اکیلے سفر کرنے کی بجائے قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے۔ اگرچہ قافلے کی حفاظت کے لئے ہتھیار بند جوان ہر قافلے کے ساتھ ہُوا کرتے تھے مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ڈاکو اُن جوانوں پر غالب آجاتے تھے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اُن جوانوں میں سے چند ایک خُفیہ طور پر ڈاکوؤں سے ملے ہوتے تھے۔

مسافروں کے قافلوں کو لوٹنے کا یہ سلسلہ سال ہا سال تک چلتا رہا۔ ڈاکو نہ صرف مسافروں کا مال اسباب لوٹتے تھے بلکہ ان کی عورتوں اور بچّوں کو پکڑ کر غلاموں کے طور پر بیچ دیتے تھے۔ یہ ڈاکو لوٹ مار کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے اِختیار کرتے تھے اور اِن کی دہشت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔

یہ سنگ دل اور بے رحم ڈاکو جو ٹھگ کہلاتے تھے،

واردات "جے کالی!" کے نعرے سے شروع کرتے تھے۔

یہ لوگ اگرچہ اپنے وقت کے تمام ہتھیاروں (مثلاً تلوار، تیر کمان، خنجر، نیزہ، بھالا) کا اِستعمال جانتے تھے مگر ان کا اپنا مخصوص ہتھیار اِن سب سے جُدا تھا۔ یہ ہتھیار ایک رومال ہوتا تھا جس کے ایک سرے پر چاندی کا روپیہ بندھا ہوتا تھا۔ وہ بانک اور بنوٹ کے خاص طور پر ماہر ہوتے تھے جس میں رومال میں بندھے ہوئے سکّے سے دشمن کی نازک جگہ پر ضرب لگائی جاتی ہے۔ اس رومال سے وہ طاقت ور سے طاقت ور آدمی کا گلا گھونٹ کر اسے چند سیکنڈ میں

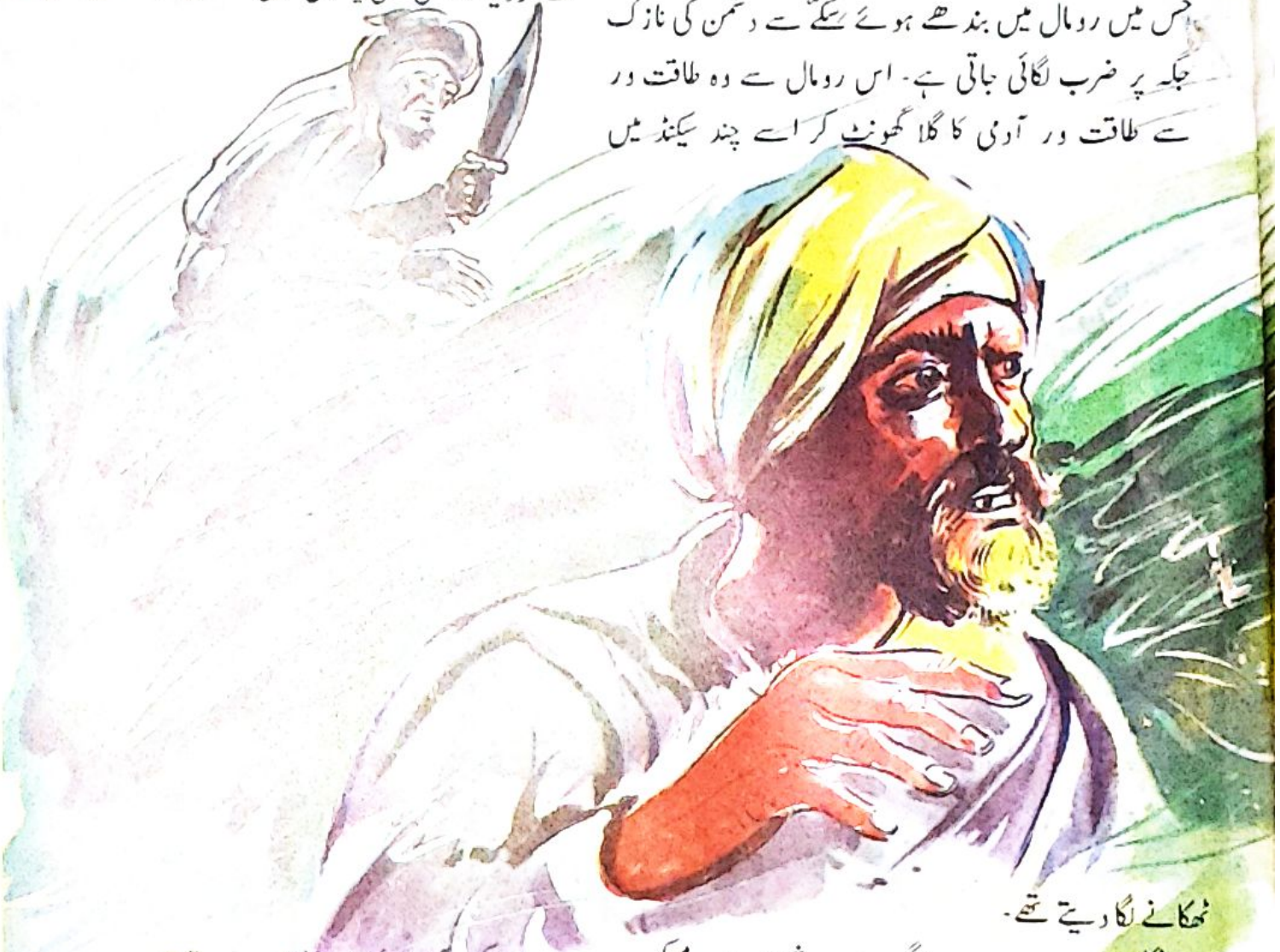

ٹھکانے لگا دیتے تھے۔

شکل و صورت سے یہ لوگ بڑے شریف اور مسکین معلوم ہوتے تھے اور کسی کو ان کے متعلّق شک تک نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے، اُس زمانے میں لوگ اکیلے سفر کرنے کی بجائے قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے اور قافلہ جتنا بڑا ہوتا تھا، اُتنا ہی اُسے محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ ٹھگوں کا گروہ اِسی بات سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ ٹھگوں کے گروہ شاہ راہوں کے چکّر لگاتے رہتے تھے۔ جب انہیں کوئی قافلہ دکھائی دیتا تو وہ اس میں شامل ہوجاتے اور قافلے والوں سے کہتے کہ ہم بھی تمہاری طرح مسافر ہیں۔ قافلے والے انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیتے تھے۔

جب ٹھگ قافلے میں شامل ہوجاتے تو وہ اپنے چند آدمیوں کو آگے بھیج دیتے تاکہ وہ ایک خاص جگہ پہنچ کر گڑھے کھودیں۔ یہ خاص جگہ عام طور پر یا تو کسی قبرستان کے نزدیک ہوتی تھی یا کوئی ایسی سُنسان جگہ ہوتی تھی جہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ ہوتا تھا۔

جب قافلہ اس خاص جگہ کے قریب پہنچتا تھا تو ٹھگوں کا ہر آدمی قافلے کے کسی نہ کسی مسافر کے پیچھے کھڑا ہوجاتا تھا۔ اُس وقت ٹھگوں کے لیڈر کی طرف سے اشارہ ہوتا اور اس اشارے کے ساتھ ہی تمام ٹھگ ایک ساتھ مل کر نعرہ لگاتے:

جے کالی! (کالی زندہ باد!)

اِس نعرے کے ساتھ ہی اُن کے رومال حرکت میں

آجاتے اور وہ قافلے کے مسافروں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتے۔ ان بدنصیب مسافروں کی لاشیں گڑھوں میں دفن کر دی جاتیں اور ان کے مال واسباب پر قبضہ کرلیا جاتا۔ اِس کارروائی کے بعد ٹھگ کالی دیوی کی پُوجا کرتے اور پھر کسی نئے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

یہ لوگ جادو اور جنتر منتر بھی جانتے تھے اور اپنے گروہ کی تعداد بڑھانے کے لئے لوگوں کے بچّے بھی اِغوا کرتے تھے۔ وہ اِن بچّوں کو ٹھگی کے قاعدے سکھانے کے لئے بہت محنت کرتے تھے۔

غوث علی شاہؒ ایک مشہور بُزرگ ہو گزرے ہیں۔ ان کے بیان کئے ہوئے حالات ایک کتاب "تذکرۂ غوثیہ" میں ملتے ہیں۔ اِس کتاب میں ایک چھوٹا سا واقعہ اِن ٹھگوں کے بارے میں بھی ملتا ہے۔ حضرت غوث علی شاہؒ ایک بار میرٹھ شہر سے خورجہ شہر کی طرف روانہ ہوئے (یہ دونوں شہر بھارت کے صوبے یوپی میں ہیں) راستے میں اُنہیں ایک لڑکا ملا جو اُن سے کہنے لگا "آپ کے پاس پانچ روپے اور ایک آنہ ہے۔"

حضرت غوث علی شاہؒ حیران رہ گئے۔ اُن کی جیب میں واقعی اُس وقت اِتنی ہی رقم تھی۔ انہوں نے کہا "ہاں، میری جیب میں اِتنی ہی رقم ہے۔ اگر تمہیں چاہئے تو لے لو۔"

لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں جی۔ مجھے نہیں چاہئے۔ میں نے تو یوں ہی کہا تھا۔"

وہ لڑکا اُن کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں حضرت غوث علی شاہؒ نے اُس سے پوچھا "سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو اور کیا تمہیں جادو آتا ہے؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "آپ کے پہلے سوال کا جواب تو میں نہیں دے سکتا۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کون ہوں اور میرے ماں باپ کون تھے۔ بچپن میں مجھ کو ٹھگ اُٹھا کر لے گئے تھے۔ میں نے ان ہی لوگوں میں پرورش پائی اور ایک منتر بھی ان سے سیکھا۔ اگر کوئی امیر آدمی مل گیا تو میں آپ کو اس منتر کا تماشا دکھاؤں گا۔"

حضرت غوث علی شاہؒ اُس لڑکے کے ساتھ شہر خورجہ میں ایک صاحِب کے ہاں پہنچے جو میرزا صاحِب کہلاتے تھے اور حضرت غوث علی شاہؒ کے ساتھ اُن کے دوستانہ تعلّقات تھے۔ ایک روز حضرت غوث علی شاہؒ نے اُس لڑکے کے سامنے میرزا صاحِب کے عِلم ودانش کی تعریف کی۔ لڑکے نے یہ تعریف سُن کر آہستہ سے کہا "آپ کہیں تو ایک تماشہ دکھاؤں؟"

حضرت غوث علی شاہؒ نے اِجازت دے دی لڑکے نے تین کنکریوں پر کوئی منتر پڑھا اور ایک یک کرکے وہ کنکریاں میرزا صاحب پر پھینکیں۔ جب تیسری کنکری میرزا صاحب کے لگی تو وہ چُپکے سے اُٹھے اور گھر کے اندر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے گھر کا سارا روپیہ پیسہ اور زیور لڑکے کے سامنے لا رکھا اور کہا "لے جاؤ! سب لے جاؤ"!

حضرت غوث علی شاہؒ نے روپیہ اور زیور اُس لڑکے سے لے کر میرزا صاحب کے گھر پہنچا دیا۔ تین دن تک میرزا صاحب پر منتر کا اثر رہا۔ چوتھے دن ہوش میں آئے تو کہنے لگے "خدا جانے کیا اَسرار تھا! تین دن تک ایک سیاہ بادل سا میرے دِل پر چھایا رہا اور مجھے اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔"

ٹھگوں کی ٹھگی کا یہ سِلسِلہ نہ جانے کب سے جاری تھا کہ 1820ء کے لگ بھگ (جب کہ ہندوستان کے ایک بڑے حصّے پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی) انگریز حکومت کی طرف سے ایک فوجی افسر کرنل وِلیم سلیمَن کو ٹھگوں کی سرکوبی کے کام پر مُقرّر کیا گیا۔ کرنل وِلیمَ نے تحقیقات کے بعد اندازہ لگایا کہ ٹھگوں کی تعداد کم از کم تین ہزار ہے اور یہ لوگ ہر سال کم از کم دس ہزار آدمیوں کو قتل کرتے رہے ہیں۔

کرنل وِلیمَ نے بڑی کوشش کے بعد ٹھگوں کے گروہ کے چند آدمی گرفتار کئے اور جب انہیں جان سے مارنے کی

دھمکی دی گئی تو انہوں نے اپنے گروہ کے دوسرے آدمیوں کے نام بتا دئے۔ حکومت نے ایک ایک کرکے اُن سب کو گرفتار کرلیا اور انہیں سزائے موت دے کر ٹھگوں کے سارے گروہ کا خاتمہ کردیا۔ یہاں تک کہ 1848ء تک کالی دیوی کے اِن پُجاری ٹھگوں کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہا۔

اِن ٹھگوں کی سرگرمیاں بہُت خفیہ ہوتی تھیں۔ اِس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اِس گروہ کے خاتمے کے بعد ایک انگریز افسر کے عِلم میں یہ بات آئی کہ اِن ٹھگوں نے ایک دفعہ اُس کے دفتر سے صرف ایک فرلانگ (220 گز) کے فاصلے پر سینکڑوں لوگوں کو قتل کرکے گڑھوں میں دبادیا تھا۔

ٹھگوں کا یہ گروہ اگرچہ کالی دیوی کا پُجاری تھا جو ہندوؤں کی ایک دیوی ہے، مگر یہ سخت حیرانی کی بات ہے کہ اِس گروہ میں ہندوؤں کے عِلاوہ مسلمان اور دوسرے مذہبوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ اِس سلسلے میں ایک مسلمان ٹھگ "امیر علی" کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے اپنی آپ بیتی "سرگزشتِ امیر علی ٹھگ" کے نام سے لکھی تھی، جس میں اُس نے ٹھگوں کی گھناؤنی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا تھا۔ یہ کتاب اب بھی بڑی دل چسپی اور حیرت سے پڑھی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آپ جانتے ہیں؟

☆ ہاتھی اپنی سُونڈ میں ڈیڑھ گیلن پانی بھر سکتا ہے۔

☆ چیونٹی کی پانچ ناکیں ہوتی ہیں۔

☆ ایک عام اِنسان ہر 6 سیکنڈ بعد آنکھیں جھپکتا ہے۔

☆ گھوڑا دِن میں کھڑے کھڑے اور رات کو لیٹ کر سوتا ہے۔

☆ مصر کا مشہور مُجسّمہ "ابُوالہوَل" حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے 2,500 برس پہلے بنایا گیا تھا۔

☆ شِکرا 290 کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑ سکتا ہے۔

☆ ہماری کہکشاں میں سب سے کم عُمر ستارہ آج سے 6 کروڑ سال پہلے پیدا ہُوا تھا۔

☆ زیبرے کے جِسم پر سفید دھاریاں ہوتی ہیں، کالی نہیں۔

☆ لندن میں سب سے پہلی ٹریفک کی بتّیاں، 1868ء میں، پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر لگائی گئی تھیں۔ یہ صِرف لال اور ہری تھیں۔

☆ امریکا میں ایک منٹ میں 12 کاریں بنتی ہیں۔

☆ کُتّے کے 42 دانت ہوتے ہیں۔

☆ امریکا میں "روم" نام کے آٹھ شہر ہیں۔

☆ جِھینگا مچھلی کا خون نیلا ہوتا ہے۔

☆ اِنڈونیشیا میں 13,000 جزیرے ہیں۔

☆ اُلّو کی آنکھ اُس کے سر کا 1/6 حصّہ ہوتی ہے۔

☆ آنکھیں کھول کر چھینکنا ناممکن ہے۔

☆ سیمنٹ شکریا چینی ملانے سے زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے۔

☆ امریکا نے الاسکا کا عِلاقہ، 1867ء میں، روس سے 70 لاکھ ڈالر میں خریدا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ رقم کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتی، لیکن 128 سال پہلے یہ بہُت بڑی رقم تھی۔

★★★★★★★★

سید نظر زیدی

ہیرو نمبر ایک

ہاکی کے آل پاکستان مقابلے ہونے والے تھے اور بہادر خاں کے اسکول میں اُنیس برس سے کم عمر کھلاڑیوں کی ٹیم بنانے کے لئے بہت زور دار میچ ہو رہے تھے۔ بہادر خاں اس ٹیم میں شامل ہونے کا حق دار تھا۔ وہ پھرتیلا اور صحت مند ہونے کے علاوہ، کھیل کی خاص خاص باتوں کو بھی خوب سمجھتا تھا، اور ان ہی سب باتوں کا نتیجہ تھا کہ اپنی ٹیم کے لڑکوں میں سب سے زیادہ گول وہی کرتا تھا۔

آج اس سلسلے کا آخری میچ تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی اُن لڑکوں کے نام بتائے جانے والے تھے جنہیں ٹیم میں شامل کیا جانا تھا۔ بہادر خاں کو پکّا یقین تھا کہ اسے ٹیم میں ضرور شامل کیا جائے گا، بلکہ اسے تو یہاں تک اُمید تھی کہ ٹیم کا کپتان اسی کو بنایا جائے گا۔

فیصلہ کرنے کے لئے قومی ٹیم کے اِک بہت بڑے کھلاڑی کو بُلایا گیا تھا جو ہیڈ ماسٹر، سیکنڈ ہیڈ ماسٹر اور دوسرے استادوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مہمان خصوصی سے درخواست کی کہ وہ ان لڑکوں کا نام بتائیں جو ان کے نزدیک مقابلوں کے لئے چُنی جانے والی ٹیم میں شامل ہونے کے حق دار تھے۔

مہمان خصوصی نے لڑکوں کے نام پکارنے سے پہلے ہاکی کے کھیل میں کام یابی حاصل کرنے کے کچھ گُر بتائے اور پھر فہرست دیکھ کر لڑکوں کے نام پکارنے لگے۔ بہادر خاں کو پکّا یقین تھا کہ اس فہرست میں اُس کا نام پہلے نمبر پر ہوگا۔ لیکن پوری فہرست ختم ہوگئی اور اس کا نام نہ آیا تو رنج اور غصّے کی وجہ سے اُس کا بُرا حال ہوگیا۔ وہ نڈھال ہوکر زمین پر بیٹھ گیا اور ایک زور دار جھٹکے کے ساتھ اپنی ہاکی دُور پھینک دی۔

غصّہ اور ناراضی ظاہر کرنے کے علاوہ اس طرح ہاکی پھینکنا کُھلی گستاخی تھی، لیکن کسی نے اُس کی طرف دھیان نہ

دیا۔ ٹیم میں شامل کئے جانے والے لڑکوں کے نام سُن کر سب زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ جن لڑکوں کو ٹیم میں شامل کیا گیا تھا، وہ تو خوشی سے ناچ رہے تھے۔ خوشی ظاہر کرنے کا یہ ہنگامہ کم ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کام یاب ہونے والے لڑکوں کو مُبارک باد دی اور اُمّید ظاہر کی کہ وہ اِن مُقابلوں میں اِسکول کا نام روشن کریں گے اور ٹرافی جیت کر لائیں گے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی تقریر کے بعد میدان خالی ہوگیا۔ بس بہادُر خاں اور خالی کرسیاں رہ گئیں۔ بہادر خاں کا حال اس وقت بہُت خراب تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور درد کی وجہ سے سر پھٹا جارہا تھا۔ ایسے مُعزّز لوگوں سے اسے ایسی کُھلی بے انصافی کی اُمّید نہ تھی۔ ٹیم چُننے کے لئے اب تک جتنے میچ ہوئے تھے، اُن میں اُس کا کھیل سب سے اچھّا رہا تھا۔ پھر اچھّا کھلاڑی ہونے کے ساتھ وہ پڑھنے لکھنے میں بھی بہُت اچھّا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آرہی تھی کہ اسے ٹیم میں کیوں شامل نہیں کیا گیا۔

وہ اِسی حالت میں بیٹھا تھا کہ کسی نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پیار بھری آواز میں کہا، "بیٹے، سب چلے گئے۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

بہادُر خاں نے چونک کر دیکھا۔ ایک بوڑھا مزدور اس کے قریب کھڑا تھا اور بہت اپنائیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کسی قدر ناراض ہوکر کہا "تم جاؤ، بابا۔ اگر میں یہاں بیٹھا ہوں تو تمہارا کیا نقصان کررہا ہوں؟"

"میرا تو نقصان نہیں کررہے، بیٹے، لیکن تم اپنا نقصان ضرور کررہے ہو۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تمہیں اس بات کا رنج ہے کہ ایک اچھا کھلاڑی ہونے کے باوجود تمہیں اس ٹیم میں کیوں شامل نہیں کیا گیا جو ہاکی کے آل پاکستان مقابلوں میں حصّہ لے گی" بوڑھے مزدور نے کہا۔ وہ پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بول رہا تھا۔

"ہاں، بالکُل۔ مجھے اس بات پر غصّہ آرہا ہے کہ ان لوگوں نے ایسی بے اِنصافی کیوں کی۔ انہوں نے مجھے چھوڑ کر ایک ایسے لڑکے کو ٹیم میں شامل کیوں کیا جس میں اس کے سِوا کوئی خوبی نہیں کہ اس کا باپ لکھ پتی ہے۔ بابا جی، میں سچ کہتا ہوں، وہ تو پوری ٹیم کے لئے مصیبت بن جائے گا۔ اسے کھیلنا آتا ہی نہیں۔" یہ کہہ کر بہادُر خاں نے آنسو پونچھے اور بوڑھے کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے اِس بے اِنصافی میں اُس نے بھی حصّہ لیا ہو۔

بوڑھا بہادُر خاں کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا اور سمجھانے کے انداز میں بولا "بیٹے، اِس دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لوگوں نے دولت کو سب سے بڑی طاقت مان لیا ہے۔ اگر تمہاری جگہ کسی امیر آدمی کے بیٹے کو ٹیم میں شامل کر لیا گیا ہے تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اب تو زیادہ تر باتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ لیکن بیٹے، جو لوگ دولت کے غرور میں بے انصافیاں کر رہے ہیں، وہ فائدے میں نہ رہیں گے، کیوں کہ ہماری اِس دنیا میں ایک قانون اور بھی جاری ہے اور وہ اللہ کا نہ بدلنے والا قانون ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بُرائی اور بے انصافی کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلتا"۔

"آپ یہ بات یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ آپ نے دیکھا نہیں ایک امیر آدمی نے بے انصافی کرائی اور اس کا بیٹا نالائق ہونے کے باوجود اس ٹیم میں شامل کر لیا گیا جو پاکستان کے بڑے شہروں میں میچ کھیلے گی۔ اِن میچوں میں حصّہ لینے والے لڑکوں کی تصویریں چھپیں گی اور اخباروں میں تعریفیں کی جائیں گی۔ جب کہ میرے بارے میں کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ میں ہاکی کا بہت اچھّا کھلاڑی ہوں اور میرے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے" بہادُر خاں نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں یہ بات اس لئے یقین سے کہہ رہا ہوں، بیٹے، کہ ایسی ہی ایک بے انصافی کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بھگت چکا ہوں" یہ کہہ کر بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر بولا "بیٹے، شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ ایک دن ایسی ہی بے انصافی ایک اور لڑکے کے ساتھ بھی ہوئی تھی اور وہ بے انصافی کرانے والا میں تھا"۔

"آپ؟ کیا باباجی آپ نے بھی کسی حق دار اور قابل لڑکے کو ٹیم میں شامل ہونے سے روک دیا تھا؟" بہادر خاں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، بیٹے۔ اب سے کوئی پچاس برس پہلے بالکل اسی طرح ہاکی کے کھلاڑیوں کی ٹیم بنائی جا رہی تھی۔ میرے دل میں شوق پیدا ہوا کہ میں بھی اس ٹیم میں شامل ہو جاؤں اور میرے امیر ابّاجان نے کچھ روپیہ خرچ کر کے میری خواہش پوری کرادی۔ انہوں نے ایک بہت اچھے کھلاڑی کو نکلوا کر مجھے ٹیم میں شامل کرا دیا"۔

"لیکن، باباجی۔ آپ تو میرا مطلب ہے، آپ تو" بہادر خاں نے بوڑھے کے میلے کچیلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا "آپ تو مزدور ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ کبھی اسکول میں داخل ہوئے ہوں گے"۔

"ہاں، بیٹے۔ اب میں واقعی ایک معمولی مزدور ہوں۔ یہ کرسیاں لینے آیا ہوں، جو تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے کرائے پر منگوائی تھیں۔ لیکن جب تمہاری عمر کا تھا تو ایک بہت بڑے اسکول میں پڑھتا تھا اور میرے امیر باپ نے مجھے اپنی دولت کے زور پر اس ٹیم میں شامل کرا دیا تھا جو پورے ملک میں میچ کھیلنے کے لئے بنائی جا رہی تھی۔ لیکن میری یہ کامیابی ہی میری تباہی کا سبب بن گئی۔ پہلی بات تو یہ ہوئی کہ پہلے میچ ہی میں میں دوسری ٹیم کے کھلاڑی کی ہاکی سے اُلجھ کر اِس طرح گرا کہ میرے داہنے ہاتھ کی ہڈّی ٹوٹ گئی، اور سر پر سخت چوٹ آئی۔ اِس سر کی چوٹ کی وجہ سے میں تعلیم جاری رکھنے کے قابل نہ رہا۔ دوسرے میرے والد صاحب ایک مُقدّمے میں پھنس گئے۔ انہیں سزا ہوگئی اور ان کا کاروبار بالکل تباہ ہوگیا۔ ہم ایسے غریب ہوگئے کہ تم آج مجھے ایک بوڑھے مزدور کی حالت میں دیکھ رہے ہو"۔

"تو کیا وہ لڑکا بھی اسی طرح زخمی ہو جائے گا اور اس کا بے ایمان باپ بھی آپ کے باپ کی طرح کسی مُقدّمے میں پھنس کر تباہ و برباد ہو جائے گا؟" بہادُر خاں نے اُمّید بھری آواز میں سوال کیا۔

بوڑھا بولا "یہ تو نہیں کہا جا سکتا، بیٹے، کیوں کہ خدا کے کام نرالے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بُرائی کرنے والے کو فوراً ہی نقصان نہیں پہنچتا۔ لیکن ایک بات میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی بھلائی ضرور ہونے والی ہے۔ ہم سب کے مالک اللہ کا یہ پکّا قانون ہے کہ جب کسی بے گناہ کو ستایا جاتا یا اس کا کوئی حق مارا جاتا ہے تو غیب سے اس کی بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ جس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہو، وہ ہِمّت ہار کر نہ بیٹھ جائے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ محنت کرے"۔

"لیکن بابا، اب میری محنت سے کیا ہوگا؟ ٹیم چُن لی گئی۔ چند دن بعد لڑکے میچ کھیلنے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ میں کتنی بھی محنت کروں، ٹیم میں شامل نہیں ہو سکتا۔ میں تو گویا ہمیشہ کے لئے ہار گیا" بہادر خاں پہلے کی طرح اُداس ہوگیا۔

بوڑھا بولا "یوں نہیں ہے، میرے بیٹے، یوں نہیں ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے کئی اور میدان بھی تو ہیں۔ اگر تم ہاکی کی ٹیم میں شامل نہیں ہوئے تو کیا ہوا۔ آج ہی سے تعلیم میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے کے لئے کوشش شروع کر دو اور امتحان میں اتنے نمبر حاصل کرو کہ تم سے

زیادہ نمبر کسی کے نہ ہوں۔ اگر تم ایسا کرو گے تو ہیرو نمبر ایک بن جاؤ گے اور ہاکی کے کھلاڑیوں سے زیادہ عزّت، شہرت اور کام یابی حاصل کرو گے"۔

بہادر خاں سنبھل کر بیٹھ گیا اور بوڑھے کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی نرالی مخلوق ہو۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دماغ کے اندر ایک کھڑکی کھُل گئی ہے اور اس سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی ہے۔ وہ کچھ دیر رُک کر بولا "بابا، آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ ہاکی نہ سہی، تعلیم تو ہے۔ میں اِن شاء اللہ اس میں ہیرو نمبر ایک بنوں گا۔ ہر مضمون میں اتنے نمبر لوں گا کہ کوئی اور اتنے نمبر نہ لے سکے گا"۔

"اِن شاء اللہ" بوڑھے نے محبّت سے کہا "لیکن بیٹے، میری ایک بات اور دل میں بٹھا لو۔ سچّی کام یابی وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہیں۔ وہ جو کام شروع کرتے ہیں، اسے کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں اپنے ایک اور گناہ کے بارے میں بھی بتا دوں۔ اگرچہ یہ بات مجھے اپنی جوانی کے زمانے ہی میں معلوم ہوگئی تھی کہ بُرائی کے راستے پر چلنے والے فائدے میں نہیں رہتے، اور بھلائی کرنے والوں کو اِنعامات ملتے ہیں۔ لیکن میں یہ باتیں بس سوچ کر رہ گیا، اِن پر عمل نہ کیا۔ اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ایک غریب بوڑھا مزدور ہوں۔ اگر عِلم حاصل کرنے کا پکّا ارادہ کرلیتا تو شاید اپنے باپ سے بھی زیادہ امیر ہوتا۔ خوب سمجھ لو، جو لوگ ہیرو بنے، یعنی انہوں نے شان دار کام یابیاں حاصل کیں، انہوں نے ایسی کامیابی حاصل کرنے کے لئے بالکل چھوٹی عمر سے کوششیں کیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آدمی چھوٹی عمر ہی میں ہیرو بنتا ہے۔ بڑا ہو کر تو اپنی کامیابی کا پھل کھاتا ہے"۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، بابا۔ لیجئے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ابھی سے ہیرو نمبر ایک بننے کی کوشش کروں گا، عِلم میں بھی اور ہاکی کے میدان میں بھی۔ اگر مجھے اِس سال ٹیم میں شامل نہیں کیا گیا تو اِن شاء اللہ اگلے سال ضرور شامل کیا جائے گا"۔

"اِن شاء اللہ" بوڑھے نے کہا اور بہادر خاں نے وہ ہاکی اُٹھالی جو کچھ دیر پہلے غصّے سے پھینک دی تھی۔ اُس کا چہرہ پکّے اِرادے کے نور سے چمک رہا تھا۔

صندوقچی کا راز

فوزیہ طاہرہ

سب بچّے اپنے دادا ابّو' خواجہ نورُ الدّین' کے اِرد گِرد بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک پرانی سی زنگ لگی صندوقچی دھری تھی' جس میں سونے کے زیورات تھے۔ خواجہ نورُ الدّین ایک ایک زیور ہاتھ میں پکڑ کر سب کو دکھا رہے تھے۔ خواجہ صاحِب کے بیٹے ظہیرُ الدّین اور ان کی بیوی' شکیلہ بیگم' بھی موجود تھے۔ ان کے تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اتنے سارے زیورات جو لاکھوں روپے کے تھے' خواجہ نورُ الدین نے اپنی مرحومہ بیوی کی نشانی سمجھ کر سنبھال رکھے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بوسیدہ سی لوہے کی الماری کو ہر وقت تالا لگا کر رکھتے تھے۔ گزشتہ دنوں محلّے میں دو چار چوریوں کی وارداتیں ہوئی تھیں۔ اس پر خواجہ نورُ الدّین نے یہ زیورات بینک کے لاکر میں رکھنے کا سوچا تھا۔ پہلے انہوں نے صندوقچی میں رکھے ہوئے زیورات کو گِنا اور پھر ان کی ایک فہرست تیّار کی تاکہ اپنے پاس بھی ریکارڈ رہے۔

"یہ جھومر کتنا خوب صورت ہے' دادا ابّو!" ننھّی رِدا نے اپنے دادا کے ہاتھ میں نگینے جڑا ہوا جھومر دیکھ کر کہا۔

"یہ جھومر ہم نے اپنی ردا بٹیا کے لئے رکھا ہے۔ جب تمہاری شادی ہوگی ناں' تب تمہیں دوں گا" دادا ابّو نے بڑے لاڈ سے کہا۔

"اونہوں! ہم اپنی گڑیا کی شادی رچائیں گے تو یہ جھومر اُسے پہنائیں گے" رِدا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اور دادا ابّو' یہ سونے کے کڑے؟" عدیل نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہاں' بھئی۔ یہ سونے کے کڑے ہم نے اپنے بڑے پوتے کی بہو کے لئے رکھے ہیں' یعنی عثمان کی دلہن کے لئے۔ اللہ رکھے کل کو اس کی بھی تو شادی ہو گی ناں" دادا ابّو نے بڑے چاؤ سے بتایا۔

"لیکن دادا ابّو' یہ اتنا بڑا' تین لڑیوں والا ہار؟ یہ کون لے گا؟" طلحہ نے پوچھا۔

؟ارے بھئی' پریشان کیوں ہوتے ہو؟ تمہاری دلہن کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا۔ یہ سب کچھ تم سب کا ہی تو ہے۔ لیکن وقت آنے پر۔ سمجھے؟" دادا ابّو نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

اگرچہ شکیلہ بیگم کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ کچھ زیورات انہیں بھی ملیں' لیکن چُپکی رہیں۔ اور یوں بھی انہیں اپنی بہن کے ہاں دعوت میں جانا تھا' اس لئے انہوں نے بچّوں

کو تیاّری کا حکم دیا۔ خواجہ نُورُ الدّین نے بڑی اِحتیاط سے تمام زیورات صندوقچی میں رکھے اور لوہے کا ایک تار اس کی چھوٹی سی کُنڈی میں پرو دیا۔

صندوقچی اتنی ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی کہ ایک بار بند ہو جاتی تو کھلنے نہ پاتی' اور اگر کھل جاتی تو بند کرنا ایک مسئلہ بن جاتا۔ یہ دیکھ کر ننھّی رِدا اپنا بسکٹوں کا خالی ڈبّا اٹھا لائی' تاکہ اُس کے دادا ابّو اپنے زیورات اس میں رکھ سکیں۔ یہ ڈبّا ٹین کا تھا۔ خواجہ نُورالدین کو اپنی پوتی کی یہ ادا بڑی اچھّی لگی اور انہوں نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

تینوں بہن بھائی اپنی خالہ شمیم کے ہاں جانے کے لئے تیاّر ہو چکے تھے۔ سہ پہر اچھّی خاصی ڈھل چکی تھی۔ گرمی کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ خواجہ نورالدین نے ننھّی رِدا کے اِصرار پر صندوقچی کا سارا زیور نئے ڈبّے میں رکھ دیا اور ڈبّا اپنی الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ الماری کے قریب ہی' دیوار پر' ان کی بندوق ٹنگی تھی۔ انہوں نے اسے اُتارا اور اُن دِنوں کے بارے میں سوچ لگے جب وہ ایک بہت اچھّے شکاری تھے۔ نشانہ ایسا تاک کر لگاتے کہ جو ایک بار ان کی بندوق کی نال کے سامنے آگیا' وہ پھر بچ کر نہ گیا۔ خواجہ نور الدین نے سوچا کہ آج وقت مل ہی گیا ہے تو کیوں نہ بندوق ہی صاف کرلی جائے۔ لہٰذا وہ بندوق لے کر باہر باغیچے میں آگئے۔

"دادا ابّو' شام ہونے والی ہے۔ رات کی رانی کے پیڑ کے نیچے سانپ ہوتا ہے۔ اس لئے کرسی ذرا پرے رکھیں" ننھی رِدا نے بڑی بوڑھیوں کی طرح اپنے دادا کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"جانتا ہوں' بٹیا' جانتا ہوں۔ یہ دیکھو۔ اتنی بڑی بندوق بھی تو میرے پاس ہے' اور چھرّے بھی ہیں۔ تم فکر نہ کرو" اس کے دادا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ظہیرُالدّین اور شکیلہ بیگم' بچّوں کو لے کر' گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ جلد سے جلد دعوت سے واپس آنا چاہتے تھے' کیوں کہ خواجہ نور الدین کو رات کو جلد سونے اور صبح جلد اٹھنے کی عادت تھی۔ دعوت میں بھی شکیلہ بیگم کا دھیان ان ہی زیورات کی طرف رہا۔ سونے کے کڑے' تین لڑیوں والا ہار' پازیب اور نہ جانے کیا کیا۔ "آخر ان زیورات پر میرا بھی تو حق ہے۔" شکیلہ بیگم آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔ لیکن کُھل کر اس بارے میں کسی سے بات نہ کرسکیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ گھر جاکر اپنے شوہر سے اس بارے میں ضرور بات کریں گی۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا زہر مار کیا اور بچّوں کو لے کر باہر آگئیں۔

"امّی جان' اگر دادا ابّو سو گئے تو دروازہ کون کھولے گا؟" ننھّی رِدا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی' دس بج رہے ہیں۔ جلدی کرنے کے باوجود بھی دیر ہو ہی گئی۔"

رِدا کے ابّو نے کہا اور گاڑی کی رفتار ذرا اور تیز کردی۔ خدا خدا کرکے گھر پہنچے۔ گاڑی کو گلی میں ہی لاک کیا اور سب دبے پاؤں چھوٹے گیٹ سے گھر میں داخل ہوئے جو کھلا ہوا تھا۔ باغیچے کی لائٹ اگرچہ بُجھی ہوئی تھی' لیکن کمرے کی روشنی کے باعث باہر ہلکی ہلکی روشنی میں راستہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ابّا جان' وہ کون ہے؟" عدیل نے اپنے والد سے خوف زدہ ہوکر کہا۔

"سب ایک طرف ہو جاؤ' اِس ستون کے پیچھے۔ یہ تو میاں جی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر امرود کے پیڑ کے نیچے کیا کررہے ہیں؟" ظہیرُالدّین نے اپنی بیگم اور بچّوں کو مُنہ پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کی تاکید کی۔ سب کے سب دم سادھ کر کھڑے ہوگئے۔ بچّے بھی حیران تھے کہ ان کے دادا ابّو اس وقت' رات کی تاریکی میں' ہاتھ میں ٹارچ لئے کیا کررہے ہیں؟ خواجہ نور الدین اپنے آس پاس کے ماحول سے بے خبر امرود کے پیڑ کے نیچے بیٹھے زمین کھودنے میں مصروف تھے۔

"ابا جان' وہ دیکھیے۔ زیور والی صندوقچی بھی ہے ان کے پاس" طلحہ نے آہستہ سے کہا۔ ظہیرالدین کبھی سوچ بھی

یں سکتے تھے کہ ان کے والد زیورات کو بینک کے لاکر میں
کھوانے کے بہانے زمین میں دفن کر دیں گے۔

وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین
یں آرہا تھا۔ اسی وقت ردا نے زور سے چھینک ماری۔
واجہ نور الدین چونک اٹھے۔ انہوں نے زور سے کہا
کون؟"

ظہیر الدین اور شکیلہ بیگم آپس میں اُونچی آواز میں
تیں کرنے لگے۔ وہ خواجہ صاحب کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ
ہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے ہیں اور انہوں نے انہیں
کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

خواجہ نورُ الدّین آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے کمرے
یں آگئے۔ کسی نے بھی ان سے اتنی رات گئے باغیچے میں
جانے کا سبب نہیں پوچھا۔ شکیلہ بیگم نے خاص طور پر بچّوں
کو اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ دادا ابّو سے کچھ نہ پوچھیں۔
خواجہ نور الدین تھک گئے تھے، اس لئے بستر پر لیٹتے ہی
خراٹے لینے لگے۔ لیکن بھلا بچّوں کو کہاں نیند آنا تھی۔ وہ
بستر پر دراز تو ہوگئے لیکن دیر تک اِس مُعمّے کو سُلجھاتے
رہے۔

"دادا ابّو بڑے چالاک ہیں۔ لاکر میں رکھنے کی بجائے
دادای اماں کے زیور زمین میں دفن کر دیئے تاکہ ہمیں پتا
نہ چلے" ننھّی ردا نے موٹی موٹی آنکھیں جھپکاتے ہوئے
کہا۔

"بات تو ایک ہی ہے۔ زیور لاکر میں رکھیں یا زمین
کے نیچے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن دادا ابّو کو جھوٹ
بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" عدیل نے سر دیوار کے ساتھ
ٹکاتے ہوئے کہا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ کیوں نہ ہم
ابھی جاکر زیورات والی صندوقچی نکال لائیں؟" عدیل نے
چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"دادا ابو کو صبح صبح تایا ابو کے ہاں بھی تو جانا ہے۔ اگر
جانے سے پہلے وہ اس جگہ زیوروں کا ڈبّا دیکھنے چلے گئے
تو؟" رِدا نے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔ تم سب میرے ساتھ باہر آؤ" عدیل
نے ردا کی بات سُن کر لاپروائی سے کہا اور انہیں اپنے
ساتھ باہر لے گیا۔ باغیچے میں ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی
تھی۔ تینوں بچّوں کو امرود کا پیڑ اچھّی طرح یاد تھا۔ زمین نرم
تھی، اس لئے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔

اب بچّوں کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ دادا ابّو کی
پُرانی صندوقچی جو وہ دعوت میں جانے سے پہلے دیکھ چکے
تھے، کچھ زیادہ ہی بھاری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ
ان کے دادا نے اپنی رقم بھی اس میں رکھ دی ہے۔ تینوں
بہن بھائی اپنی فتح پر بہت خوش تھے۔ وہ دبے پاؤں واپس
اپنے کمرے میں آئے۔ سب کے دل بُری طرح دھڑک
رہے تھے۔ صندوقچی مٹّی سے اٹی ہوئی تھی۔

"اگر صبح اٹھ کر دادا ابو نے اس جگہ کو کھود کر دیکھا
تو؟" عدیل اس خیال سے ہی کانپ گیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا
تھا۔ انہوں نے صندوقچی کو الماری میں چھپا دیا تاکہ صبح دادا
ابو کے جانے کے بعد کھولا جائے۔ اب رات گہری ہو چکی
تھی۔ خواجہ نور الدین کے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔
تینوں بچّے یوں سہمے ہوئے تھے جیسے کوئی بہت بڑی چوری
کرکے آئے ہوں۔

"بھیّا، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اگر کوئی چور یہ
زیور نکال کر لے جاتا تو؟ اچھّا ہوا ناں کہ ہم لے آئے"
ردا نے طلحہ کا حوصلہ بڑھایا۔

"اچھا، اب ہمیں لائٹ آف کر دینی چاہئے۔ اگر امّی ابّو
کی آنکھ کھل گئی تو شامت آجائے گی" عدیل نے سرگوشی
کے سے انداز میں کہا اور بتّی بجھانے کے لئے اُٹھا۔ وہ اس
بات سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کے امّی ابّو بھی صندوقچی
کا مُعمّا حل کرنے کی کوشش میں جاگ رہے ہیں۔ شکیلہ بیگم
نے اپنے شوہر ظہیر الدین سے زیورات کے سلسلے میں بات
کی تھی۔ اب وہ دونوں اس انتظار میں تھے کہ بچّوں کے
کمرے کی بتّی بجھے تو وہ خود اس جگہ کا جائزہ لے کر آئیں،

جہاں خواجہ صاحب نے صندوقچی گاڑی تھی۔

شکیلہ بیگم تو اِصرار کر رہی تھیں کہ وہاں سے صندوقچی نکال لانی چاہئے' کیوں کہ اس پر ان کا زیادہ حق ہے۔ آخر ظہیرُالدّین کو اپنی بیگم کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ دونوں دبے پاؤں باغیچے میں گئے۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی اِنتہا نہ رہی کہ امرود کے پیڑ کے نیچے سے صندوقچی غائب تھی!

"صندوقچی کون لے گیا.....؟" شکیلہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔ ظہیر الدین کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ دونوں میاں بیوی واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ شکیلہ بیگم کی رہی سہی اُمّید بھی جاتی رہی۔

"میاں جی کو کسی پڑوسی کے نوکر نے زمین میں صندوقچی دفن کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا' اور وہ پھر دیوار پھلانگ کر ....." شکیلہ بیگم نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ لیکن ظہیرالدین نے تسلّی دی کہ ہمیں صبح اٹھ کر میاں جی سے خود ہی اس بارے میں بات کرنی چاہئے۔

چڑیوں کے چہچہانے سے پہلے ہی تینوں بچّے جاگ گئے تھے۔ لیکن میاں جی اپنے بستر پر نہیں تھے۔

"میرے خیال میں دادا ابو تایا جان کے ہاں گئے ہیں" ننھی ردا نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی لگتا ہے۔ سنو! امی ابو کی باتوں کی آواز بھی آرہی ہے۔ چلو' یہ صندوقچی وہاں جاکر کھولتے ہیں" عدیل نے کہا اور وہ تینوں امی ابو کے کمرے کی طرف چل دیئے ان کے امی ابو اپنے بچوں کو اتنی صبح اپنے کمرے میں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔

"خیریت تو ہے؟ اتنی صبح کیسے جاگ گئے؟ اور عدیل یہ تم نے کاغذ میں کیا لپیٹ رکھا ہے؟" امّی نے پوچھا۔

"امّی جان' یہ ..... صندوقچی ..... دادا ابّو کی زیوروں والی صندوقچی" طلحہ نے ڈرتے ڈرتے کہا اور عدیل نے اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی صندوقچی ان کے سامنے رکھ دی۔

"ارے! یہ تمہارے پاس کیسے آئی؟ واقعی' یہ تو وہی صندوقچی ہے۔ بالکل وہی ہے۔" شکیلہ بیگم کی تو خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ انہیں یوں لگا جیسے کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ ظہیر الدین بھی سمجھ گئے کہ یہ کارستانی ان کے اپنے بچوں کی تھی۔ یہ بھی شکر ہے کہ خواجہ نور الدین فجر کے وقت ہی گھر سے جاچکے تھے۔ اس لئے سب کو کھُل کر خوشی منانے کا موقع مل گیا۔

"ابّا جان' یہ کچھ بھاری لگ رہی ہے۔ دادا ابّو نے اپنے روپے بھی اس میں رکھے ہوں گے۔ جلدی سے کھولیں" عدیل نے بے چینی سے کہا۔

ظہیرُالدّین صندوقچی کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگے جو زنگ آلود ہونے کے باعث کُھل نہیں رہی تھی۔ آخر ہتھوڑی کی دو چار ہلکی ہلکی ضربیں لگائی گئیں اور جب ظہیرُ الدّین نے صندوقچی کو جھٹکے سے کھولا تو سب کی چیخیں نکل گئیں "سانپ!..... سانپ! لیکن یہ تو مرا ہُوا ہے!" سب بدحواسی میں اپنی اپنی ہانکے جارہے تھے۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ صندوقچی میں زیورات کی بجائے مُردہ سانپ ہوگا!

"ابّا جان' زیور کہیں سانپ تو نہیں بن گئے؟" رِدا ڈر کر بولی۔

"چُپ کرو رِدا۔ پاگلوں جیسی باتیں کرتی رہتی ہو" عدیل نے اُسے ڈانٹا۔

"یہ سب کھیل ہمیں دھوکا دینے کے لئے میاں جی نے کھیلا ہے" شکیلہ بیگم نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔

ظہیرُالدّین سر پکڑے بیٹھے تھے۔ انہیں تو خود کچھ نہیں سُوجھ رہا تھا کہ یہ مُردہ سانپ اِس صندوقچی میں کس طرح آگیا! ننھّی رِدا تو مُردہ سانپ سے اس قدر ڈر گئی تھی کہ روئے جارہی تھی۔ "ہائے! میرا جھومر۔ اب میں اپنی گڑیا کو کیا پہناؤں گی؟"

"ہماری بِٹیا کیوں رو رہی ہے؟" خواجہ نُورُالدّین نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر کمرے کا عجیب سا منظر دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ "صندوقچی؟ مُردہ سانپ؟ ارے بھئی' یہ صندوقچی یہاں کیسے پہنچ گئی؟" انہوں نے حیران پریشان ہوکر کہا۔ لیکن کسی کے پاس جواب دینے کے لئے کچھ بھی تو نہ تھا۔ سب کے سب نظریں چُرا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ خواجہ صاحِب مُعاملے کی تہ تک پہنچ پاتے' ننھّی رِدا نے انہیں رات کا سارا قصّہ سُنا ڈالا۔ اب تو خواجہ نورالدین کی ہنسی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"لیکن دادا ابّو' ہم تو سمجھتے تھے ..... کہ ....." اِس سے پہلے کہ عدیل اپنی بات مکمّل کرتا' خواجہ نورُالدّین نے سوچا کہ اِس مُعمّے کو سُلجھا ہی دیا جائے۔ انہوں نے اپنی چھڑی سے مردہ سانپ کو اٹھا کر دوبارہ صندوقچی میں رکھا اور کہا "یہ وہی سانپ ہے جو اکثر ہم رات کی رانی کے پیڑ کے آس پاس دیکھا کرتے تھے۔ بس' پچھلی رات بھی جب میں بندوق صاف کرنے کے لئے باغیچے میں گیا تو اس سانپ کو کچھ فاصلے پر کُنڈلی مارے بیٹھا دیکھا۔ خوش قسمتی سے بندوق میں گولی تھی۔ ایسا نشانہ تاک کے لگایا کہ سانپ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ زیورات تو میں پہلے ہی رِدا کے دِیئے ہوئے ڈبّے میں رکھ چکا تھا۔ اب میں نے سوچا کہ اگر سانپ یوں ہی زمین میں دفن کردیا تو کوئی اڑوس پڑوس کا کُتّا یا کوئی اور جانور اِسے کھا کر کہیں باؤلا نہ ہو جائے۔ اس لئے اِس پُرانی صندوقچی میں اسے ڈالا اور امرود کے پیڑ کے نیچے دفن کردیا۔"

"لیکن میاں جی' آپ کو تو آج' فجر کے وقت' بڑے بھائی کے ہاں جانا تھا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ....."

"بھئی' جانا تو مجھے واقعی تھا۔ لیکن ابھی تو میں چہل قدمی کے لئے گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی تمہاری ایسی چیخیں سُنیں کہ اللہ کی پناہ!" یہ کہہ کر خواجہ نُورُ الدّین نے مُردہ سانپ والی صندوقچی اٹھائی اور باہر کی جانِب مُڑے۔

"دادا ابّو' آپ پھر اس صندوقچی کو دفن کر دیں گے؟" ننھّی رِدا نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"کیا اِسے پھر غائب کرنے کا اِرادہ ہے تمہارا؟" ظہیر الدین نے بیٹی کی طرف محبّت بھرے انداز میں دیکھ کر کہا۔

"ابّو جی' آپ بِالکُل اچھّے نہیں ہیں۔" ننھّی رِدا کِھسیانی سی ہوکر ہنس دی اور جھوٹ موٹ رونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آنکھیں ملنے لگی۔

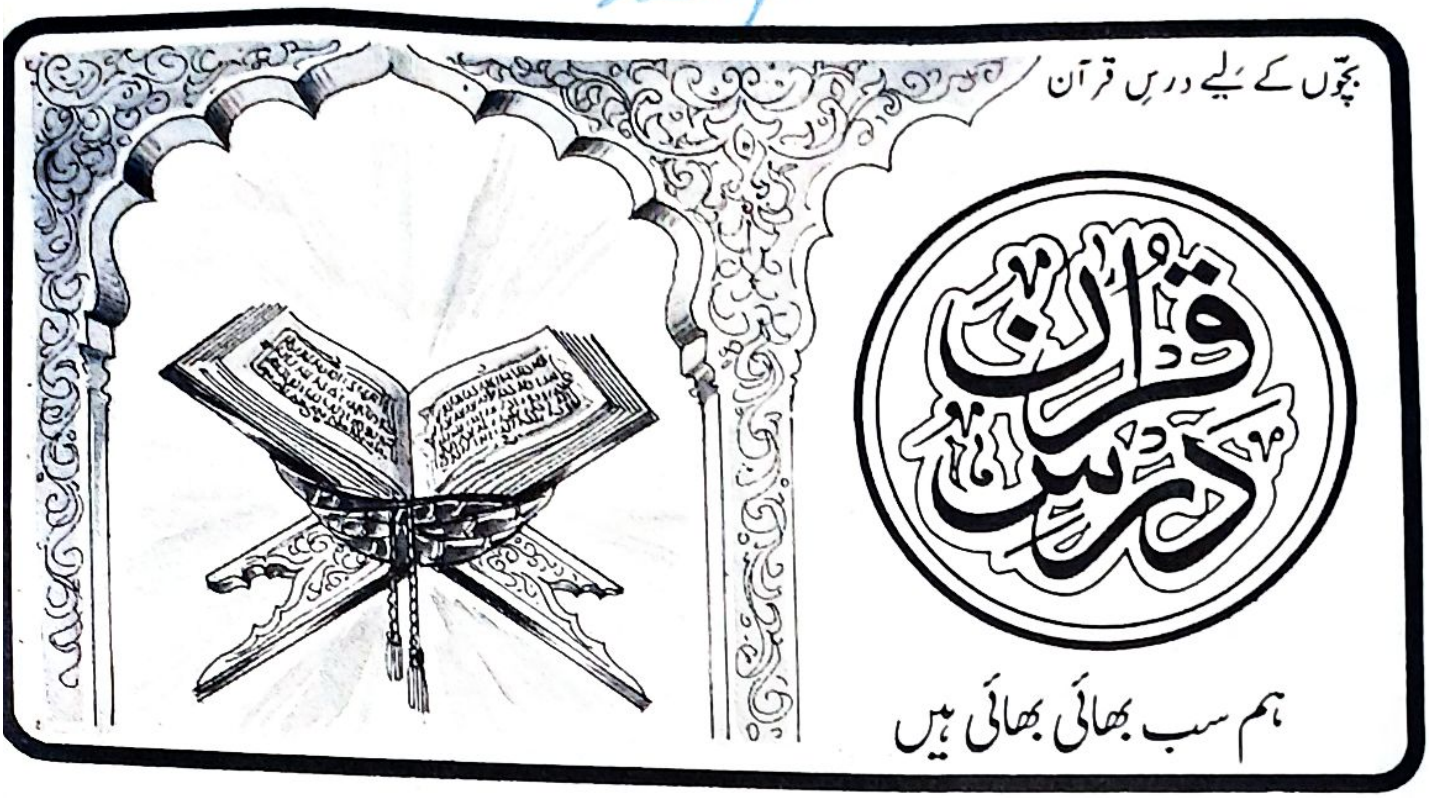

بچوں کے لیے درسِ قرآن

درس قرآن

ہم سب بھائی بھائی ہیں

بچوں کے لئے درسِ قرآن میں اس دفعہ ہمارا موضوع ہے : ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ موضوع کی وضاحت کے لئے ہم نے پارہ نمبر26، سورت نمبر49 کی آیت نمبر10 کے مندرجہ ذیل الفاظ چنے ہیں:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ

اس کا لفظی ترجمہ یوں ہے: بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ چوں کہ دنیا بھر کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس لئے انہیں ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح پیار محبت سے پیش آنا چاہئے۔ کسی وجہ سے بھی کسی کی دل آزاری کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو یہ نکتہ پلّے باندھ لینا چاہئے کہ آپ نے زندگی کے ہر مقام اور ہر مرحلے پر قرآنِ حکیم کی یہ نصیحت ہمیشہ سامنے رکھنی ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اپنی اجتماعی زندگی کے کئی مرحلوں میں مسلمانوں نے اسلامی اخوت کی بڑی شاندار مثالیں قائم کی ہیں۔ مگر ایسے وقت بھی آتے رہے ہیں جب مسلمانوں نے اس قرآنی نصیحت سے صاف غفلت کا ثبوت دیا اور نتیجے کے طور پر بے حد نقصان اٹھایا۔

موجودہ پاکستان کی مثال ہی لے لیجئے۔ بدقسمتی سے ہمارے پیارے اور خوبصورت شہر کراچی میں ان دنوں جو دنگے فساد ہو رہے ہیں وہ اسلامی اخوت کی صریح خلاف ورزی ہیں۔ مانا کہ اس قتل و غارت کے پیچھے ہندوستان کا ہاتھ ہے، تاہم انہیں جلد از جلد ختم کرنا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔

ڈاکٹر عبدالروف

داناؤں کی سُنہری باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سُنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچّو، آج میں آپ کو بڑے بڑے داناؤں اور تجربہ کار لوگوں کی سنہری باتیں سنانا چاہتی ہوں۔ ان باتوں پر عمل کرنے والے عظیم انسان بنے ہیں۔ اگر آپ بھی عظیم اور کام یاب انسان بننا چاہتے ہیں تو یہ باتیں غور سے سننا اور عمر بھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہنا۔

☆ "کوئی دن بغیر ایک سطر لکھے نہ گزرنے پائے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر روز لکھنے سے انسان خوش خط بھی ہوتا ہے اور اچھا اہلِ قلم بھی۔

☆ "عبادت صرف اور فقط ایک اللہ کی کرو۔"

اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب ہے، اس کے قوانین و احکام اور تعلیمات پر عمل کرنا، اس کی اطاعت و بندگی کرنا۔

☆ "جو کوئی آپ سے گناہ یا بُرائی کی بات کرنے کو کہے، وہ آپ کا دشمن شیطان ہے۔"

شیطان کا کہا نہیں ماننا چاہئے، بلکہ اس سے دور رہنا چاہئے۔ دشمنوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

☆ "دوست بنانا ہے تو نیک اور شریف لوگوں کو دوست بنائیں۔"

بُرے اور شریر لوگوں کی صُحبت سے دور رہنا چاہئے، ورنہ وہ آپ کو بھی بُرا اور شریر بنا دیں گے۔

☆ "خوش خُلقی اچھّی عادت ہے۔"

لوگ خوش خُلق انسان سے مَحبّت کرتے ہیں۔ خوش خُلقی کا مطلب ہے، بڑوں کا ادب اور ان کی عزّت کرنا، لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملنا، ناگوار بات سن کر غصّے میں آنے یا لڑنے بِھڑنے کے بجائے غصّہ پی جانا اور صبر کرنا۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ خوش خلقی بھی عبادت ہے۔

☆ "محنت میں عظمت ہے۔"

اس کا مطلب ہے کہ محنت کے عادی لوگ ہی عظیم بنتے ہیں، ایسے لوگ ہی اِیجاد و اِختراع کرتے ہیں، بڑے بڑے عالم و فاضل، مشہور ادیب و مُصنّف اور نامور کھلاڑی بنتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ محنت کامیابی کی کنجی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں وہی قومیں عظیم اور ترقی یافتہ بنی ہیں جو محنتی تھیں۔ بخلاف اس کے، کاہل اور کام چور قومیں ہمیشہ پس ماندہ و ناکام رہی ہیں۔ محنت کرو اور کرتے رہو، اور اس میں عزت محسوس کرو۔

☆ "جھوٹ کبھی نہ بولو۔"

وجہ یہ ہے کہ جھوٹ جھوٹے کو لوگوں کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔ جھوٹ سے انسان کی ساکھ جاتی رہتی ہے۔ ساکھ نہ رہے تو انسان ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جھوٹ انسان کو بدکردار اور مجرم بنا دیتا ہے۔ اگر انسان جھوٹ بولنے والا نہ ہو تو وہ برا کام نہیں کر سکتا۔ جھوٹا انسان خود اپنی نظروں میں ذلیل و حقیر ہو جاتا ہے۔

برعکس اس کے، سچ انسان کو معتبر اور محترم بناتا ہے۔ لوگ سچے انسان کی عزت اور اعتبار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے سچ کامیابی کا ذریعہ ہے۔ سچ انسان کا وقار ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ

"ہمیشہ سچ بولو، خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہو۔"

سچی گواہی دو، چاہے اپنے رشتے داروں، دوستوں اور خود اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ کیوں کہ سچ برائی اور جرم کے خلاف ڈھال ہے۔

☆ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ

"باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔"

ہمیشہ اپنے استاد اور بڑوں کا ادب کرو۔ وہ آپ پر شفقت کریں گے اور آپ کی تعریف کریں گے۔ بزرگوں کی دعائیں لینا ہو تو ان کا ادب و احترام کرو۔ ان کی باتیں غور سے سنو۔

☆ "جو دم غافل، سو دم کافر۔"

اس کہاوت کا مطلب ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو، اس لئے کہ وہ وقت اکارت جاتا ہے، جس میں آدمی اپنے رب رحمٰن کو بھول جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے انسان کو اطمینان ملتا ہے، اور اس کے دل میں خوف و غم کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

☆ "وقت دولت ہے۔ اس کی قدر کرو۔"

جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ انہیں کامیابی نصیب ہوتی ہے نہ عظمت۔ دوسرے لفظوں میں، وہ ناکام و نامراد رہتے ہیں۔

☆ "وقت پر کھانا، وقت پر پڑھنا لکھنا اور وقت پر ہی کھیلنا چاہئے۔"

اس مقولے پر عمل کرنے سے انسان تن درست رہتا ہے اور ہر امتحان میں کامیاب ہوتا ہے۔

☆ "دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑا آرام کرو اور شام کا کھانا کھانے کے بعد سیر کرو۔"

ایسا کرنا صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

☆ "غرور کا سر نیچا۔"

یہ کہاوت بہت مشہور اور سچی ہے۔ غرور و تکبر کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی نظر میں ذلیل و حقیر ہو جاتا ہے۔ اس لئے انسان کو کبھی تکبر نہیں کرنا چاہئے۔

☆ "قرآن مجید علم و حکمت کا سرچشمہ ہے۔"

قرآن سے علم و حکمت سیکھو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو سوچ سمجھ کر پڑھو اور اس کی ہر آیت میں بامقصد غور و فکر کرنے کو اپنا معمول بنالو۔

قیمت میں اضافہ

کاغذ کی قیمت میں اضافے کی وجہ سے مجبوراً اگلے مہینے سے تعلیم و تربیت کی قیمت میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اگست 95ء سے تعلیم و تربیت کی قیمت 15 روپے (فی پرچہ) ہوگی

سلیم احمد صدیقی

ہالینڈ کی لوک کہانی

نان بائی کی ڈاڑھی

آج ہم آپ کو ایک بہت پُرانے زمانے کی کہانی سُناتے ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسے آدمی کی ہے جو ہالینڈ کے ایک گاؤں میں رہتا تھا اور اپنے گاؤں کا سب سے زیادہ عقل مند آدمی تھا۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ نہ تو وہ پادری تھا' نہ اِسکول ماسٹر' نہ درزی اور نہ دُکان دار۔ وہ نان بائی تھا یعنی ڈبل روٹیاں بنانے والا۔

وہ ایک بھاری بھرکم جِسم اور نکلتے ہوئے قد کا آدمی تھا اور ہمیشہ خوش رہا کرتا تھا۔ اُس کی تین بیٹیاں' دو بِلّیاں اور ایک بیوی تھی۔ نہ تو وہ بے حد امیر تھا' نہ بہت غریب۔ نہ بے حد خوب صورت تھا اور نہ بہت بدصورت۔ بس واجبی سی شکل و صورت تھی۔ البتّہ عقل و دانِش اُسے اللہ میاں نے ڈھیروں کے حساب سے عطا فرمائی تھی۔ اور وہ کنجوس بھی نہیں تھا۔ یعنی وہ اپنی عقل کو دل کھول کر اِستعمال کرتا تھا۔ وہ مریضوں کو طرح طرح کے نسخے بتایا کرتا تھا جن کے اِستعمال سے وہ صِحّت یاب ہو جاتے تھے۔ وہ کم عِلموں کو عِلم کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ ضرورت مندوں کو مُفید مشورے دیا کرتا تھا' جن پر عمل کرکے اُن کا بھلا ہوتا۔ اور لُطف کی بات یہ ہے کہ اِن مشوروں اور نسخوں کے بدلے میں وہ کسی سے ایک پیسہ تک نہ لیتا تھا۔ شاید اِسی لئے اُس کی دکان میں لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

اب اِس سارے قصّے میں ایک مزے کی بات یہ ہے کہ اُس کی بہت لمبی چوڑی ڈاڑھی تھی اور لوگ سمجھتے تھے کہ اُس کی عقل مندی کی وجہ اُس کی لمبی ڈاڑھی ہے۔ اور ایک طرح سے یہ بات دُرُست بھی دکھائی دیتی تھی کیوں کہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی ڈاڑھی بھی بڑھتی جارہی تھی اور عقل مندی میں بھی اِضافہ ہو رہا تھا۔ اُس کی بیوی صبح سویرے، پہلی دستک پر، دروازہ کھول دیتی اور اس کے بعد اس کے دروازے پر لوگوں کی قطار لگ جاتی۔ قطار لگانے کا طریقہ بھی ان لوگوں کو نان بائی نے ہی بتایا تھا، ورنہ پہلے پہل تو وہ لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح گھر میں گھُسے چلے آتے تھے۔ یہ سب لوگ اس سے کسی نہ کسی بارے میں مشورہ لینے آتے تھے۔

"بھائی نان بائی، رات سے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ کیا کروں؟"

"بھائی نان بائی، کل میرے ہاں بیٹی کے رشتے کے لئے لوگ آرہے ہیں۔ کیا کروں؟"

"بھائی نان بائی، رات ہمارے گھر میں چور گھُس آیا۔ چور کا پتا کیسے چلاؤں؟"

اب بھائی نان بائی ہر ایک کو مشورہ دیئے جارہا ہے اور لوگ اس کے آٹے کی میز پر چڑھے چلے آرہے ہیں، اس کی بلیّوں کی دُموں کو پاؤں تلے روند رہے ہیں، بلیاں چیخ رہی ہیں۔ باہر پھول بوٹوں پر لوگ چڑھے جارہے ہیں، اور نان بائی آٹے کے پیڑے بھی بنائے جارہا ہے اور مشورے بھی دیئے جارہا ہے۔ ایسا روز ہی ہُوا کرتا تھا۔

کبھی کبھار نان بائی کی بیوی روہانسی ہو جاتی اور کہتی "کاش! میری شادی کسی بے وقوف سے ہو جاتی تو میں اس ہنگامے سے تو بچی رہتی۔ نہ تو میرے پھول بُوٹے مسلے جاتے، نہ میری بلیّوں کی دُمیں کچلی جاتیں۔ بس ہم آرام سے اپنا وقت گزارا کرتے۔" عجب بات یہ ہے کہ کبھی کبھار نان بائی بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملانے لگتا اور کہتا "کاش! میں بے وقوف ہوتا۔ اب دیکھو ناں، بعض وقت میں کھانا بھی نہیں کھاسکتا۔ کیوں کہ فُلاں صاحِب یا فُلاں صاحِبہ کو مشورہ دے رہا ہوتا ہوں۔ بعض دن تو ایسے آتے ہیں کہ رات کو سونا بھی نصیب نہیں ہوتا، کیوں کہ کسی مریض کے گھر جاکر اسے دوا دینی ہوتی ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود نان بائی تھا بہت خوش۔ وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ اس کی عقل مندی اللہ میاں کی دین ہے، اس لئے اس سے کام لے کر اسے اللہ کے بندوں کی مصیبتوں اور مشکلوں کو دور کرتے رہنا چاہئے۔

اس کی یہ بات تھی بھی ٹھیک۔ لیکن یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ اس کے پاس آنے والے آدھے سے زیادہ لوگوں کو اس کے مشوروں کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔ مگر وہ سمجھتے نہ تھے۔ دراصل کوئی اہم مسئلہ تو کبھی کبھار ہی کسی کو پیش آتا تھا، ورنہ زیادہ تر لوگ تو ایسی باتیں کرتے تھے:

"بھائی نان بائی، ایک شخص نے میرے دو روپے دینے ہیں۔ کہتا ہے جب ہوں گے تو دے دوں گا۔"

"بھائی نان بائی، ایک آدمی نے میری مُرغی کی ٹانگ توڑ دی ہے۔"

"بھائی نان بائی، رات پڑوسی سے میرا جھگڑا ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارا مُرغا آدھی رات کو ہی بانگ دینے لگتا ہے۔"

"بھائی نان بائی، میرا پڑوسی کہتا ہے کہ میری بکری کے جسم پر ایک لاکھ بال ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دو لاکھ ہیں۔"

بس، زیادہ تر لوگ تو ایسی ہی اُلٹی سیدھی باتیں پوچھنے آتے تھے۔ اب یہ باتیں ان کے لئے تو شاید بہت ضروری ہوتی ہوں گی، لیکن اصل میں تو یہ بے کار باتیں تھیں۔ بہرحال، بے چارہ نان بائی ان سب باتوں کے جواب بڑی عقل مندی سے دیتا تھا۔

لیکن صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک دن نائی بائی کے صبر کی بھی حد ہوگئی، اور یہ حد اُس دن ہوئی جس دن

اس نے اپنی سب سے بڑی بیٹی کی شادی کی۔ شادی کے دن بجائے اِس کے کہ نائی بائی لڑکی کی خوشیوں میں شریک ہوتا' وہ لڑکے والوں اور ان کے عزیزوں کے اُوٹ پٹانگ مسئلوں کو حل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بیٹی کی رُخصتی کے وقت اس کے سر پر ہاتھ بھی نہ پھیر سکا' کیوں کہ اس وقت بھی وہ کسی کی مشکل حل کرنے میں مصروف تھا۔

بیٹی کی رُخصتی کے بعد مہمانوں نے جانا شروع کیا تو نان بائی نے دو مہمانوں کی گُفت گُو سُنی۔ وہ کہہ رہے تھے:

"بھائی صاحِب' دیکھا آپ نے؟ بھائی نان بائی کتنے عقل مند آدمی ہیں۔"

"اور اُن کی عقل مندی اُن کی لمبی ڈاڑھی کی وجہ سے ہے۔"

"اور کیا۔ اگر میری بھی اِتنی بڑی ڈاڑھی ہوتی تو میں بھی اِتنا ہی عقل مند ہوتا۔"

"تم تو ہو ہی بے وقوف۔ تمہاری اِتنی لمبی ڈاڑھی ہوتی کیسے؟"

بے چارے نان بائی نے سوچا کہ کاش! یہ ڈاڑھی اِس بے وقوف کو مل جاتی اور وہ لوگوں کے سوالوں کے جواب دیا کرتا۔ کاش! اس کی ڈاڑھی کسی طرح چھوٹی ہو جائے اور لوگ اسے عقل مند سمجھنا چھوڑ دیں۔

اُس رات نان بائی بہت دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس کی ڈاڑھی کس طرح چھوٹی ہو سکتی ہے۔ ہمّت کرکے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی ڈاڑھی کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس اپنے بستر پر آیا اور جلد ہی خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگا۔

اگلی صبح اس کی آنکھ بیوی کی چیخوں سے کُھلی!

"اے جی! سُنتے ہو؟ ذرا آئینے میں تو دیکھو۔ تمہاری ڈاڑھی چھوٹی ہوگئی ہے" وہ چِلّا چِلّا کر اُسے بتا رہی تھی۔

نان بائی نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کی بیوی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کی ڈاڑھی آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی۔ دوپہر تک یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی اور لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے:

"تم نے تازہ خبر سُنی؟ نان بائی کی ڈاڑھی آدھی سے بھی چھوٹی ہوگئی ہے اور اُس کی ساری عقل مندی بھی ختم ہوگئی ہے۔"

"ہاں' اب تو اُس کی ڈاڑھی ہماری ڈاڑھی جِتنی ہے۔ عقل مندی تو ختم ہونی ہی تھی۔"

اُس دن کسی نے اس سے مشورہ نہ لیا اور نہ کسی مسئلے کا حل ہی اس سے پوچھا۔ بلکہ بعض عورتوں نے تو اس کی بیوی سے آکر اِظہارِ افسوس بھی کیا۔

"چچ چچ! اب تو تمہارے میاں عام آدمی بن گئے ہیں۔ ہمیں تم سے ہم دردی ہے۔"

لیکن نان بائی بہت خوش تھا۔ اُس رات اُس نے اپنا کھانا اِطمینان سے بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کھایا۔ رات کو ڈٹ کر سویا اور صبح کو اِطمینان سے آٹا گُوندھنا شروع کیا۔ شام کے وقت دو عورتیں اُس کی دُکان کے باہر باتیں کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اس نے اچانک ان کی گُفت گُو سن لی۔

"درزی کی بیٹی اب بچتی نظر نہیں آتی" ایک کہہ رہی تھی۔

"ہاں' میرا تو خیال ہے کہ کل تک بے چاری مر جائے گی۔ اگر نان بائی عقل مند رہتا تو شاید اس کی جان بچ جاتی" دوسری کہہ رہی تھی۔

اُس شام نان بائی نے دکان ذرا جلدی ہی بند کردی اور تیز تیز چلتا ہوا درزی کے گھر پہنچا۔ درزی نے سلام دُعا کے بعد کہا "میری بیٹی بہت بیمار ہے۔"

"ہاں' مجھے پتا چلا ہے" نان بائی نے کہا "اور میں تمہاری بیٹی کا علاج کرنے ہی آیا ہوں۔"

درزی نے اپنا گنجا سر غم سے ہلایا اور بولا "وہ پہلے بیمار ہوتی تو تم علاج کرلیتے۔ لیکن اب کیا فائدہ؟ اب تو تمہاری ڈاڑھی چھوٹی ہوگئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم بھی اُتنے ہی

بے وقوف بن گئے ہو جتنے کہ دوسرے لوگ ہیں۔ بُرا نہ ماننا بھائی، لوگ یہی کہتے ہیں۔"

"اِس بحث کو چھوڑو اور مجھے اندر لے چلو۔ میں ایک شرط پر تمہاری بیٹی کا علاج کروں گا اور خدا نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گی" نان بائی بولا۔

"میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ بس میری بیٹی کو تن دُرُست کردو" درزی نے کہا۔

"وہ شرط یہ ہے کہ کسی کو یہ نہ بتانا کہ تمہاری بیٹی میرے علاج سے ٹھیک ہوئی ہے" نان بائی نے آہستہ سے کہا۔

درزی نے وعدہ کرلیا۔ نان بائی نے دوا بناکر درزی کی بیٹی کو دی اور رات کے اندھیرے میں گھر واپس آگیا۔

صبح کو تمام گاؤں میں درزی کی بیٹی کی صحت یابی کا چرچا ہو رہا تھا۔

"یہ مُعجزہ ہی ہوگیا" ایک شخص کہہ رہا تھا۔

"ہاں، اور کیا" دوسرا بولا "ورنہ اُس کے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی"۔

نان بائی اُن کی باتیں سُن کر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ درزی اپنے وعدے پر قائم رہا تھا۔ اس نے کسی کو اِس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی تھی۔ بعد میں یہ وعدہ گاؤں کے بہت سے لوگوں نے نان بائی سے کیا اور رفتہ رفتہ سارے گاؤں والوں کو معلوم ہوگیا کہ نان بائی بے وقوف نہیں بلکہ پہلے ہی جیسا عقل مند ہے۔ لیکن ہر شخص اُس شرط کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اِس راز کا صرف اُسی کو پتا ہے دوسرے لوگ نہیں جانتے۔

گاؤں کے لوگ تو نہیں جانتے تھے کہ نان بائی کی ڈاڑھی چھوٹی کیسے ہوئی۔ لیکن آپ ان سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ آپ جان گئے ہوں گے۔ دراصل بیٹی کی رُخصتی کے بعد رات کو نان بائی نے سونے سے پہلے، اپنی ڈاڑھی خود کاٹ کر چھوٹی کرلی تھی تاکہ لوگ اُس سے وقت بے وقت احمقانہ سوالات پُوچھنا چھوڑ دیں۔ اب نان بائی کی دکان پر لوگ صرف روٹیاں خریدنے کے لئے آتے تھے۔ اب اس کے پھول بُوٹے بھی محفوظ ہوگئے تھے اور بلّیوں کی دُمیں بھی کُچلے جانے سے بچ گئی تھیں۔ لیکن جب کسی کو سچ مُچ کسی مسئلے کے سِلسلے میں نان بائی کے مشورے کی ضرورت پڑتی تو یا تو وہ چُپکے سے آکر اس سے مشورہ لے لیتا یا نان بائی خود اس کے پاس جاکر اسے مشورہ دے دیتا۔ اور گاؤں کے لوگوں کو رفتہ رفتہ اب یہ بات بھی معلوم ہوگئی تھی کہ عقل مندی کا تعلق لمبی ڈاڑھی سے نہیں بلکہ عِلم، تجربے اور ذہانت سے ہے۔

****

گرمیوں کی چھٹّیاں

محمّد انوار احمد

ہوں گی جب اپنی چھٹّیاں
جائیں گے پنڈی بھٹّیاں[1]
نانی ہماری ہیں وہاں
اور وہاں ہیں ماموں جاں
جائیں گے اُن کے گھر پہ ہم
آئیں گے اُن سے مِل کے ہم
ماموں گھُمائیں گے ہمیں
سیریں کرائیں گے ہمیں
کھیتوں میں گھومیں گے وہاں
باغوں میں جھولیں گے وہاں
کھائیں گے پھل اور سبزیاں
تازہ، ہری، ترکاریاں
پھر ہوکے ہم سب تازہ دم
لوٹیں گے واپس گھر کو ہم
پھر بیٹھ کر لِکھّیں گے ہم
خوب ایک اچّھی سی نظم
پھر سب کو ہم دِکھلائیں گے
اور داد سب سے پائیں گے
اب کے جو ہوں گی چھٹّیاں
جائیں گے پنڈی بھٹّیاں

[1] پنجاب کا ایک چھوٹا سا شہر

محیط اسمٰعیل

انگوٹھی کہاں گئی؟

گرم گرم پکوڑوں کی مہک سارے محلّے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بِنیش کے ابّو گھر میں داخل ہوئے تو آہٹ پاکر بنیش دوڑی "ابّو' ابّو' آج امّی پکوڑے تل رہی ہیں۔" وہ شفقت سے مسکرائے' ذرا جھکے اور حسبِ معمول بریف کیس ایک طرف رکھتے ہوئے بچّی کو بانہوں میں بھرلیا۔ پھر اُس کے ماتھے پر بوسے کا پھول رکھنے کے بعد بولے "بیٹے' آج ابّو کو سلام کرنا بھول گئیں؟"

"سوری ابّو۔ السّلامُ علیکمُ۔ مگر ابّو، ہر بار ہم ہی سلام کرتے ہیں۔ کبھی آپ بھی ہمیں وَعلیکمُ السّلام کہنے کا موقع دیں۔"

بنیش کا یہ شِکوہ سُن کر اس کے ابّو ہنسے اور بولے "ٹھیک ہے' بیٹا۔ ہم آپ کو یہ موقع دیں گے اور آیندہ سلام میں پہل کرنے کا ثواب بھی حاصل کریں گے۔"

بنیش نے خوش ہوکر تالی بجائی۔ ابّو اُسے گود میں اٹھائے باورچی خانے میں آئے اور بیوی سے پُوچھا "بھئی' پکوڑوں میں مرچیں زیادہ تو نہیں ہیں؟"

بنیش کی امّی نے کہا "چکھ کر دیکھ لیں۔ مجھے تو ٹھیک ہی لگتی ہیں۔"

"آپ نے چکھ لیا ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوں گی۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے بِنیش کو نیچے اُتارا اور بیوی سے کہا "بھئی' ایک خوش خبری ہے آپ لوگوں کے لئے۔"

بِنیش ابّو کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور بولی "ابّو جی' ابّو جی' پہلے ہمیں سُنائیں" یہ کہہ کر اُس نے اپنا دایاں کان اُوپر کی طرف کردیا۔ بنیش کی امّی نے دل میں سوچا کہ تنخواہ بڑھی ہوگی۔ اللہ کرے یہی خوش خبری ہو۔ اِدھر بنیش کے ابّو نے اس کے کان میں کچھ کہا' جسے سُنتے ہی اس نے چیخ ماری اور بولی "آہا! آہا! کل حُمیرا پھوپھو اور پھوپھا جان ملتان سے آرہے ہیں!"

بنیش کی امّی نے دریافت کیا کہ وہ لوگ کس وقت آئیں گے اور یہ کہ اور کون کون آرہا ہے۔

"ٹیلی فون پر زیادہ بات نہیں ہوسکی۔ میرا خیال ہے حُمیرا اور اس کے میاں آرہے ہیں۔ بس" بنیش کے ابّو نے کہا۔ اِس کے ساتھ ہی انہیں ایک بات یاد آگئی۔ کہنے لگے "حُمیرا کو پکوڑے بہت پسند ہیں۔ تھوڑا سا بیسن رکھ چھوڑنا۔"

"جی' جناب۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ مجھے

معلوم ہے کہ حمیرا پکوڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ اب آپ جلدی سے مُنہ ہاتھ دھو آئیں۔ آپ کے پکوڑے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔"

بینش اپنی امّی کو خوش خبری سُنانے کے بعد ہوا کے گھوڑے پر سوار اپنی سہیلی کے گھر پہنچی تاکہ اسے بھی یہ خوش خبری سنا سکے۔ اس کے ابّو نے بریف کیس کو اپنے کمرے میں الماری کے اندر رکھا، کپڑے تبدیل کئے اور منہ ہاتھ دھو کر کھانے کے کمرے میں آگئے۔ بینش کی امّی نے میز پر پکوڑے لاکر رکھے اور پوچھا "آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ لوگ کس گاڑی سے آرہے ہیں۔"

"ارے ہاں، صبح چھ بجے کی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں" انہوں نے جواب دیا اور بینش کو گود میں بٹھا لیا جو ابھی ابھی سہیلی کے گھر سے لوٹی تھی۔

"ابو جی، ریلوے اسٹیشن ہمیں بھی لے چلیں گے ناں آپ؟"

ابّو نے "اچھا" کہا اور پکوڑے کھانے لگے۔

"صبح عُمر مارکیٹ سے ٹیکسی لے لیں گے۔ تم بھی چلنا" ابّو نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔ آپ ہی جائیں۔ میں دوپہر کا کھانا تیار کروں گی" بینش کی امّی نے جواب دیا اور چائے لینے چلی گئیں۔ باپ بیٹی پکوڑوں کے ساتھ ساتھ ملتان کی یاد تازہ کرتے رہے۔ اتنے میں چائے آگئی۔

چائے پیتے ہوئے امّی کی نظر بینش کے ہاتھ پر پڑی تو وہ چونک پڑیں۔ بینش کی اُنگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔ انہوں نے پوچھا "بیٹے، انگوٹھی کہاں ہے؟"

بینش نے اپنی اُنگلیوں کو دیکھا اور پھر کندھے اُچکاتے ہوئے بولی "پتا نہیں، امّی۔"

"جاؤ، واش بیسن میں دیکھ کر آؤ۔ منہ ہاتھ دھوتے وقت گر گئی ہوگی۔"

بینش کے ابّو نے اُنہیں ٹوکا "چائے تو پی لینے دو بچّی کو۔ دو پیسے کی چیز کے لئے اسے تنگ کر رہی ہو۔"

"کیا کہا؟ دو پیسے کی چیز؟ سونے کی انگوٹھی ہے۔ میرے بھائی نے دی تھی، اِس کی سال گرہ پر۔ جاؤ، بینش، غسل خانے میں جاکر دیکھو۔"

بینش نے واپس آکر بتایا " امّی جان، انگوٹھی نہیں ملی۔ میں نے سارا غسل خانہ دیکھ لیا ہے۔" پھر امّی کو گھورتا دیکھ کر اس نے نظریں جُھکالیں۔ دراصل اس کی امّی گھور نہیں رہی تھیں، سوچ رہی تھیں کہ انگوٹھی بچّی نے کہاں رکھی ہوگی۔ "جاؤ، اور اپنی سہیلی کے گھر دیکھ کر آؤ" انہوں نے بینش کو حکم دیا۔

تھوڑی دیر بعد بینش واپس آگئی، مگر خالی ہاتھ۔

"امی جی، وہاں بھی نہیں ہے" اس کے چہرے پر اب پریشانی کے آثار تھے۔ امی نے ناراض ہوکر فیصلہ سُنایا کہ وہ آئندہ اپنی سہیلی کے ہاں نہیں جائے گی۔

صبح 5 بجے بینش کے ابّو جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی باورچی خانے میں کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے جماہی لیتے ہوئے کہا "بینش کو جگا کر تیار کردو"۔

"وہ نہیں جاسکے گی۔ اُسے ہلکا ہلکا بخار ہے۔"

"اِس کا مطلب ہے کہ تم نے بے چاری کو خوب ہلکان کیا ہوگا، اُس انگوٹھی کے پیچھے" بینش کے ابّو بولے۔

"بچّوں کو بچپن ہی سے اپنی چیزوں کا خیال رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے" بینش کی امّی نے کہا۔

"تو پھر میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں" ابّو بولے۔

جب بینش اٹھی تو اس کے ابّو ریلوے اسٹیشن جاچکے تھے۔ انہیں گھر میں نہ پاکر اس نے امی سے پوچھا "ابو ہمیں کیوں نہیں لے گئے؟ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔"

امی نے کہا "بیٹے، تمہیں بخار ہے۔ اس حالت میں لے جانا مناسب نہ تھا۔"

بینش نے اپنا ہاتھ گلے اور ماتھے پر لگایا اور کہا "کہاں ہے بخار؟ دیکھیے، ہم تو ٹھیک ہیں بالکل۔" وہ رونے لگی۔

"ارے بیٹا، بخار ہلکا ہے۔ تمہیں محسوس نہیں ہو رہا۔ وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے۔ رو نہیں، ورنہ پھوپھو کہیں گی کہ بینش کو ہمارے آنے کی خوشی نہیں ہوئی، اِسی لئے

رو رہی ہے۔"

بینش مسکرانے لگی۔ امّی اُسے غسل خانے میں لے گئیں۔ کپڑے پہلے سے اِستری کئے رکھے تھے۔ غسل کے بعد اسے پہنائے۔ پھر بال بنا کر میز پر دودھ کا گلاس رکھا ہی تھا کہ ٹیکسی کے رُکنے کی آواز آئی۔ بینش سمجھ گئی کہ ابّو مہمانوں کو لے آئے ہیں۔ اس نے گلی کی طرف کا دروازہ کھولا تو سامنے اس کی حُمیرا پھوپھو اپنی عینک اور شال سنبھالتے ہوئے گاڑی سے اُتر رہی تھیں۔ پھوپھا جان دوسری طرف سے نکل رہے تھے اور ابّو ڈِکی میں سے سامان نکال رہے تھے۔

بینش نے "پھوپھو جان" اِتنی بلند آواز سے کہا کہ پورے محلّے نے سُن لیا ہوگا۔ اُس کی پھوپھو نے اسے اُٹھا لیا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ ابّو نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور سب گھر میں داخل ہوئے۔ بینش کی امی اور پھوپھو گلے ملیں۔ انہوں نے اپنے نندوئی کو سلام کیا۔ پھر سب لوگ صوفوں پر بیٹھ کر خیر خیریت معلوم کرنے لگے۔

پھوپھو نے کہا "بھئی، ہمیں تو زوروں کی بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو ہو تو لے آؤ۔"

"کچھ کیوں؟ بہت کچھ ہے، بلکہ آپ کی جان پکوڑے بھی" یہ سُننا تھا کہ پھوپھو نے بڑا سا منہ کھولا اور کہا "آخاہ!" بینش کے پھوپھا نے کہا "جلدی سے ان کے منہ کے نیچے بالٹی رکھ دیجئے۔ پکوڑوں کے نام سے ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔" پھوپھو نے فوراً منہ بند کیا اور مصنوعی غصّے سے اپنے میاں کو گھورنے لگیں۔

بینش کی امّی نے میز پر ناشتا لگا دیا۔ وہ لوگ منہ ہاتھ دھو کر آگئے۔ حمیرا کی پھوپھی نے پکوڑوں سے منہ بھر لیا اور مزے لے لے کر کھانے لگیں۔ ساتھ ساتھ تعریف بھی کرتی جاتیں "واہ واہ! سُبحان اللہ! کیا خوب! بہت مزے کے ہیں!" ان کے میاں بھی تعریف میں سر ہلا رہے تھے۔ حمیرا پھوپھو تعریف کرتی جاتیں اور منہ میں پکوڑے رکھتی جاتیں۔ لیکن ابھی چوتھا پکوڑا ہی منہ میں ڈالا تھا کہ ایک دم چیخ پڑیں اور دونوں ہاتھوں سے جبڑا پکڑ لیا۔ "ہائے! ہائے! ہائے

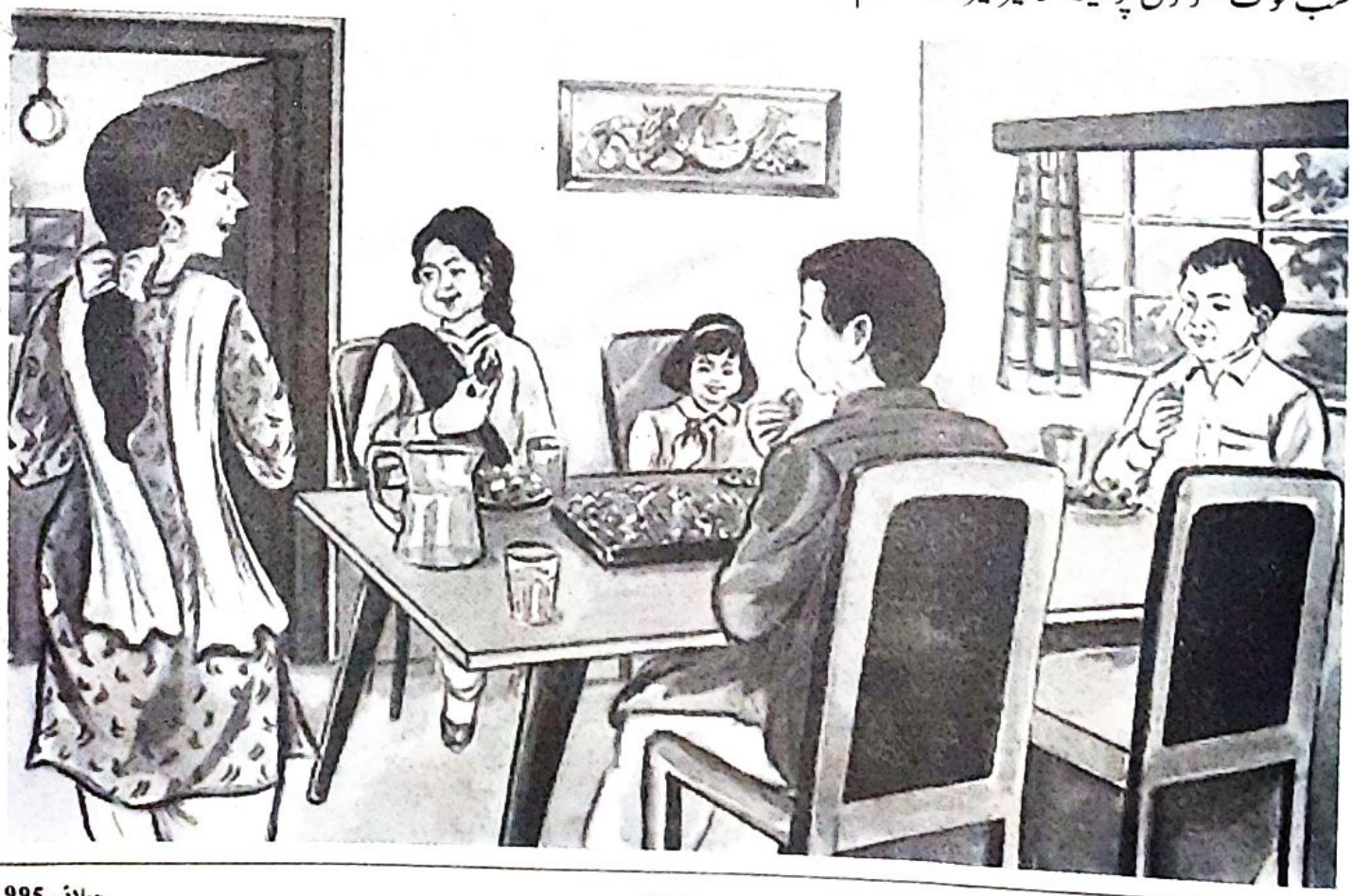

میرے اللہ! ہائے میری ڈاڑھ!" ان کی چیخیں سُن کر ابّو نے ان کا سر تھاما۔ حمیرا کے میاں بھی قریب آگئے۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا؟"

"ہائے میری ڈاڑھ! ہائے ہائے!" حمیرا پھوپھی اب رونے لگی تھیں "کوئی سخت چیز میری ڈاڑھ میں پھنس گئی ہے" یہ الفاظ انہوں نے بڑی مشکل اور تکلیف سے ادا کئے۔ بینش کے ابّو ان کا مُنہ زیادہ نہ کھول سکے تو ان کے میاں نے کوشش کی، جس سے تکلیف زیادہ ہوگئی۔

بینش کے ابّو ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرنے باہر کی طرف دوڑے۔ بینش تھوڑی سی رُوئی لے آئی کیوں کہ اس کی پھوپھو کے مُنہ سے خون نکل رہا تھا۔ ابّو پڑوس سے ٹیلی فون کر آئے تھے۔

"ہائے میرے اللہ! ہائے میری ڈاڑھ! ہائے ہائے!" حمیرا پھوپھی کی چیخیں رُکنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ اُن کے

شوہر نے اُنگلیوں پر رومال لپیٹا اور بیوی کا منہ کھول کر اندر دیکھا۔ کوئی باریک سی، گول سی، چمکتی ہوئی چیز ڈاڑھ میں پھنسی ہوئی تھی۔ بینش اور اس کے امّی ابّو بھی اندر جھانک کر دیکھنے لگے۔ لیکن ٹھیک سے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا بلا ہے؟

پھر بینش کی امی نے ہلکی سی چیخ ماری اور بولیں "یہ بینش کی انگوٹھی ہے!"

"بینش کی انگوٹھی؟" بینش کے پھوپھا اور ابّو نے پہلے بینش کی امّی کو حیرت سے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ "بینش کی انگوٹھی یہاں کیسے آگئی؟" ابّو نے سوچا۔ یہی سوال بینش اور اس کی امی اور اس کے پھوپھا کے ذہن میں بھی اُبھرا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجنے سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں۔ بینش کے ابو انہیں اندر لے آئے۔ وہ یہ جان کر بہُت حیران ہوئے کہ حمیرا پھوپھی کی ڈاڑھ میں انگوٹھی پھنسی ہوئی ہے۔ انہوں نے ان کے مسوڑھے میں ٹیکا لگایا۔ اِس کے بعد دو تین آلات باری باری استعمال کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈاڑھ میں سے انگوٹھی نکال کر بینش کے ابّو کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ بینش نے حیرانی سے مُڑی تُڑی انگوٹھی کو دیکھا پھر دوڑ کر ماچس کی خالی ڈبّی لے آئی اور انگوٹھی کو اس میں رکھ دیا۔

بینش کے ابو ڈاکٹر کو باہر چھوڑ کر واپس آئے تو ان کی بیوی، بہن اور بہنوئی سر جوڑے بیٹھے تھے اور یہ مُعمّا حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انگوٹھی پکوڑے میں کیسے چلی گئی؟ بینش کے ابّو نے کچھ سوچا اور پھر اپنی بیوی سے پوچھا "بینش نے بیسن میں ہاتھ تو نہیں ڈالا تھا؟"

بیوی نے جواب دیا "ہاں، ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ ضد کر رہی تھی کہ وہ بھی پکوڑے بنائے گی۔"

"بس تو یہ مُعمّا حل ہوگیا۔ انگوٹھی اُنگلی سے نکل کر بیسن میں گر گئی اور وہاں سے پکوڑے میں آگئی۔ اللہ اللہ خیر سلاّ!" ابّو نے کہا۔

جنگ

دو قوموں یا گروہوں کے درمیان ہونے والی ایسی لڑائی جس میں جدید ہتھیاروں کا آزادانہ اِستعمال کیا گیا ہو' جنگ کہلاتی ہے۔ جنگ کی دو قسمیں ہیں: بَینَ الاَقوامی جنگ اور خانہ جنگی۔ بینَ الاقوامی جنگ دو یا دو سے زیادہ قوموں کے درمیان لڑی جاتی ہے' اور خانہ جنگی ایک ہی ملک کے باشندوں کے درمیان ہوتی ہے۔

ایک اندازے کے مُطابق گزشتہ پانچ ہزار برسوں کے دوران میں' دنیا میں' تقریباً 14,500 جنگیں لڑی جا چکی ہیں' جن میں 4 ارب سے زیادہ انسان ہلاک ہوئے۔ بیسوی صدی کی ہول ناک ترین جنگیں جنگِ عظیم اوّل (پہلی بڑی جنگ) اور جنگِ عظیم دوم (دوسری بڑی جنگ) تھیں۔ اِن میں 6 کروڑ سے زیادہ اِنسانی جانیں ضائع ہوئیں اور 11 کروڑ انسان لُولے لنگڑے ہو گئے۔

جنگِ عظیم اوّل

دنیا کی یہ پہلی سب سے بڑی جنگ 1914ء سے 1918ء تک (چار سال) لڑی گئی۔ اِس جنگ میں ایک طرف جرمنی' تُرکی اور بلغاریہ تھے' اور دوسری طرف برطانیہ' فرانس' روس' اٹلی' رومانیہ' پُرتگال' جاپان اور امریکا۔ اِس میں جرمنی' تُرکی اور بلغاریہ کو شِکست ہوئی اور انہوں نے 11 نومبر 1918ء کو صُلح کی درخواست کی۔ 28 جون 1919ء کو دونوں فریقوں کے درمیان فرانس کے ایک شہر "ورسائی" میں صلح کا مُعاہدہ ہو گیا۔ جنگِ عظیم اوّل میں تقریباً ایک کروڑ آدمی موت کے گھاٹ اُترے اور 2 کروڑ کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔

جنگِ عظیم دوم

جنگِ عظیم دوم کا بیج اُسی وقت بو دیا گیا تھا جب معاہدہ ورسائی پر دست خط ہوئے۔ لیکن اِس کا باقاعدہ آغاز 3 ستمبر

1939ء کو ہوا جب جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا اور برطانیہ نے، پولینڈ کی حمایت میں، جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ اِس سے پہلے برطانیہ چاہتا تھا کہ جرمنی کا حاکم، ہٹلر، زیادہ سے زیادہ طاقت پکڑجائے اور وہ روس پر حملہ کردے۔ لیکن جب ہٹلر نے روس کے بجائے پولینڈ پر حملہ کیا تو انگریز گھبرا گئے اور اُنہوں نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اِعلان کر دیا۔

اِس جنگ میں ایک طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان تھے اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس اور امریکا۔ جنگِ عظیم دوم کے اہم واقعات یہ ہیں:

یکم ستمبر1939 : جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کردیا۔

3 ستمبر1939 : برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔

9 اپریل 1940 : جرمنی نے ڈنمارک پر قبضہ کرلیا۔ اِس کے بعد ناروے کو بھی فتح کرلیا۔

10 مئی 1940 : جرمنی نے بلجیئم، ہالینڈ اور لک سَم بَرگ پر حملہ کردیا۔

13 جون 1940 : جرمنی نے فرانس کے دارُالحکومت، پیرِس، پر قبضہ کرلیا۔ فرانس نے ہتھار ڈال دیے۔

22 جون 1941 : جرمنی نے روس پر حملہ کردیا۔ روسیوں نے جرمن فوجوں کا بُھرکس نکال دیا۔ جرمنوں کا بہُت نُقصان ہوا۔

7 دسمبر1941 : جاپان نے امریکی ہوائی اڈّے، پرل ہاربر، پر حملہ کر کے اُس کی اِینٹ سے اِینٹ بجادی۔

9 ستمبر1943 : اٹلی نے ہتھیار ڈال دیے۔

یکم مئی 1945 : روس اور امریکا کی فوجیں جرمنی کے دارُالحکومت، برلن، میں داخل ہوگئیں۔ جرمنی کے حاکم، ہٹلر، نے خود کشی کرلی۔ 7 مئی کو جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن جاپان ڈٹا رہا۔

6 اگست 1945 : امریکا نے جاپان کے ایک شہر، ہیروشیما، پر ایٹم بم گرایا، جس سے تقریباً سارا شہر تباہ ہو گیا۔ اِس پر بھی جاپان نے ہتھیار نہیں ڈالے۔

9 اگست 1945 : امریکا نے جاپان کے دوسرے شہر، ناگاساکی، پر ایٹم بم گرایا۔

14 اگست 1945 : جاپان نے ہتھیار ڈال دیے، اور اِس طرح دنیا کی یہ سب سے بھیانک جنگ ختم ہوگئی۔

جنگِ عظیم دوم میں 61 ملکوں نے حصّہ لیا اور لڑنے والی فوجوں کی تعداد ایک ارب سے زیادہ تھی۔ تقریباً 40 ملکوں کی سرزمین اِس جنگ سے مُتاثّر ہوئی اور 5 کروڑ کے قریب لوگ ہلاک ہوئے۔ سب سے زیادہ نقصان روس کا ہوا۔ اِس کے تقریباً 2 کروڑ لوگ ہلاک اور 3 کروڑ سے زیاہ زخمی ہوئے۔ تقریباً 1710 رُوسی شہر اور قصبے، 70,000 گاؤں اور 32,000 کارخانے تباہ ہوئے۔ برطانیہ کے 375,000، فرانس کے 600,000 اور امریکا کے 405,000 لوگ کام آئے۔ تقریباً 6,500,000 جرمن موت کے گھاٹ اُترے اور 1,600,000 اٹلی وغیرہ کے لوگ ہلاک ہوئے۔ جاپان کے 1,900,000 لوگ مارے گئے۔ پولینڈ اور یوگوسلاویہ کا بھی بہت نقصان ہوا۔ پچھلے دنوں اِس جنگ کی 50 ویں برسی منائی گئی۔

آج کل کی جنگ اِتنی مہنگی ہو چکی ہے کہ عام آدمی اِس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ ایک ایف 14 لڑاکا طیّارے پر جتنی رقم صَرف ہوتی ہے، اِتنی رقم سے اعلیٰ درجے کے 9 اِسکول، اور ایک ٹینک کی قیمت سے تین کمروں کے 36 فلیٹ بنائے جاسکتے ہیں۔ ایک ٹینک بٹالین کی جنگی مشقوں پر جتنی رقم خرچ ہوتی ہے، اُس سے 78 کنڈر گارٹن اِسکول اور ایک دُور مار مِسائل (مِزائل) کی قیمت سے اعلیٰ درجے کے 5 ہسپتال قائم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک طیّارہ بردار بحری جہاز پر جتنی لاگت آتی ہے، اُس سے ایک بہُت بڑا بجلی گھر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ (س۔ل)

ڈاکٹر رضوان ثاقب

بلاعنوان

اس کہانی کا عنوان تحریر کیجئے' اور 250 روپے کی کتابیں حاصل کیجئے۔ آخری تاریخ 10 جولائی 1995ء

یہ عجیب و غریب واقعہ جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں' اس وقت کا ہے جب میں نویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ میرے دسمبر ٹسٹ قریب تھے' اس لئے میں رات گئے تک پڑھتا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ہی کمرے میں سوتا تھا۔ مگر وہ تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور جلدی سو جاتا تھا۔ وہ لحاف میں منہ دے کر یا منہ پر کپڑا رکھ کر سونے کا عادی نہ تھا اور اسے روشنی میں بھی نیند نہ آتی تھی۔ اس لئے میرے لائٹ جلانے سے وہ بہت پریشان ہوتا تھا۔ اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے میں نے ایک دن ابا جان سے ٹیبل لیمپ کا کہا تو انہوں نے کمال کی چستی دکھائی اور اگلے ہی دن میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی صرف میری میز پر رہتی تھی اور باقی سارے کمرے میں اندھیرا ہوتا تھا۔ اس طرح میرا چھوٹا بھائی تو نیند کے خوب مزے لوٹتا البتہ میں اس اندھرے میں ذرا سی آہٹ پاکر بھی چونک اٹھتا۔ چوں کہ ہمارے گھر کے دوسرے لوگ رات کو گیارہ بارہ بجے تک جاگتے رہتے تھے' اس لئے مجھے تسلی رہتی تھی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

ان دنوں ہمارے گھر ہماری خالہ آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بچے گڑیا' سحری اور شانی بھی تھے۔ وہ رات کو ایسی عجیب و غریب شرارتیں کرتے کہ لاکھ کوشش کے باوجود میں مطالعہ نہ کر پاتا۔ اس پریشانی کے علاوہ خالہ کے آنے کا مجھے فائدہ بھی ہوا تھا۔ خالہ جان نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کوئی آدمی چاروں قل پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونک مارے اور پھر ہاتھ سارے جسم پر پھیر لے تو وہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت میں آجاتا ہے۔ اب میں ہر رات ایسا ہی کرتا تھا اور پھر نڈر ہو کر پڑھتا تھا۔ مگر اب خالہ جان کے بچے مجھے پڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ میرے دو تین دن تو ایسے ہی ضائع ہو گئے مگر آخر کار میں نے اس پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں رات کے پہلے پہر کے بجائے پچھلے پہر اٹھ کر پڑھا کروں گا۔ اس وقت بچے سو چکے ہوں گے اور مجھے کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ لہٰذا میں نے گھڑی میں تین بجے کا الارم لگا کر اسے اپنی چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور خود سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری چوں کہ رات کو دیر تک مطالعہ کرنے کی عادت تھی' اس لئے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ مگر کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر الارم کی ٹرن ٹرن سے ہی کھلی۔

میں نے جلدی سے اٹھ کر گھڑی کا الارم بند کیا اور پھر ٹائم دیکھا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ ہر طرف ایسا سناٹا تھا کہ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ چھوٹے بھائی کے سانس لینے کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کیا اور پڑھنے لگا۔ مگر مجھے اس خاموشی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسی وقت خوف کو بھگانے والا وہ نسخہ یاد آیا جو خالہ جان نے بتایا تھا۔ میں نے جلدی سے چاروں قل پڑھے اور اپنے پورے جسم پر ہاتھ پھیر لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنے پورے جسم پر لوہے کا خول چڑھا لیا ہو۔ پہلے میں کرسی پر بیٹھ کر پاؤں زمین پر نہیں لگاتا تھا کہ کہیں سانپ نہ کاٹ لے۔ مگر قل پڑھنے کے بعد اب میں دونوں پاؤں زمین پر ٹکائے بیٹھا تھا۔

میں نے دروازے میں اندر سے تالا لگا دیا تھا۔ اب باہر سے وہی شخص اندر داخل ہو سکتا تھا جس کے پاس اس

کی چابی ہوتی' اور چابی صرف میرے پاس تھی۔ اس کے علاوہ اس کی دو اور چابیاں بھی تھیں جو میری میز کی دراز میں پڑی رہتی تھیں۔

مجھے پڑھتے ہوئے مشکل سے آدھا گھنٹا ہوا ہوگا کہ دروازے کے باہر ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ "کوئی جانور ہوگا" میرے ذہن میں خیال آیا اور مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کمرے کے تالے میں چابی گھما رہا ہے۔ میرے تھوڑی دیر کے لئے کان کھڑے ہوئے' مگر پھر میں نے سوچا کہ اگر کوئی چور ڈاکو اندر داخل ہو بھی جائے گا تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کیوں کہ میں تو اللہ کی پناہ میں ہوں۔ لیکن وہ کہیں میرے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے؟ پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ اس کے پاس چابی کہاں سے آگئی۔ میں نے جلدی سے اپنی میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر مجھے پیتل کا "کی رنگ" نظر آیا جس میں میرے کمرے کی دونوں چابیاں موجود تھیں۔ اب میں مطمئن ہوگیا تھا۔

تالے کے اندر چابی گھمانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کون ہے مگر میرے حلق سے آواز نہیں نکل پارہی تھی۔ میں اس قدر پریشان تھا کہ دراز میں چابیاں دیکھنے کے بعد دراز بند کرنا بھی بھول گیا تھا وہ ابھی تک اسی طرح کھلی ہوئی تھی اور اس میں نیلے رنگ کا ڈاک کا وہ لفافہ نظر آرہا تھا جو کسی افلاطون خان نے مجھے بھیجا تھا۔ میرا اس نام کا کوئی دوست نہ تھا اور پھر اس کے اندر موجود کاغذ پر چند اشعار کے علاوہ اس نے کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ میں نے اس خط کا ذکر اپنی امی جان سے کیا تو انہوں نے یہ کہ کر مجھے تسلی دی تھی کہ بیٹا' بعض حاسد لوگ امتحانوں کے دنوں میں طالب علموں کو پریشان کرنے کے لئے ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتے ہیں' تاکہ وہ اچھی طرح تیاری کرکے اچھے نمبروں سے پاس نہ ہوسکیں تم کو اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔

امی جان کی یہ بات اور تالے میں گھومنے والی چابی کی آواز میرے ذہن میں اکٹھی ہوئیں تو میں نے سوچا کہ یہ بھی کوئی حاسد ہی ہوگا جو مجھے پریشان کرکے میری توجہ مطالعے سے ہٹانا چاہتا ہوگا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے دراز کو بند کرنے کے لئے اندر کی طرف دھکیلا تو اس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تالے میں گھومنے والی چابی کی آواز آنا بند ہوگئی۔ میں پھر مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

ابھی مشکل سے پانچ چھ منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا تو صرف اتنا نظر آیا کہ کوئی شخص اندر جھانک رہا ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو اس نے مجھے دیکھتے ہی دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا مگر وہ اتنی دیر میں برآمدے سے نکل کر صحن میں آگیا تھا۔ میں اب چور' چور' چور کہ کر شور مچا رہا تھا اور وہ چور ہمارے گھر کی دیوار پھلانگنے کی کوشش کررہا تھا۔ دیوار ذرا اونچی تھی' اس لئے اسے پھلانگنے کے لئے چور کو مشکل پیش آرہی تھی۔

اتنی دیر میں میری چیخ پکار سن کر میرے گھر والے بھی اٹھ کر برآمدے میں آگئے تھے۔ ابا جان نے ایک بڑا سا لٹھ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور وہ "کدھر ہے؟ کدھر ہے؟" کہ رہے تھے۔ میں نے جب ہاتھ کے اشارے سے بتایا تو اس وقت تک چور دیوار پر چڑھ چکا تھا اور گلی میں چھلانگ لگانے ہی والا تھا۔ ابا جان نے آگے بڑھ کر اس زور سے اس کے لاٹھی ماری کہ اس کا کچومر نکل گیا ہوگا۔ مگر نہ جانے کیوں' میں اس منظر کو دیکھنے کی جرات نہ کرسکا اور میں نے اسی لمحے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مگر یہ کیا؟ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو صحن میں سوائے امی کے اور کوئی نہ تھا۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ ابا جان

کے لٹھ مارنے سے پہلے چور چھلانگ لگانے میں کام یاب ہوگیا ہوگا اور اب سب اس کے تعاقب میں باہر گئے ہوں گے۔ میں جلدی سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بڑے بھائی، چھوٹا بھائی اور ابا جان کے علاوہ بہت سے ہمسائے ایک پرانی سائیکل کے گرد دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔

ایک شخص نے میرے ابا جان سے پوچھا "خاں صاحب، کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟"

"پتا نہیں۔ یہ تو دیکھنے سے ہی معلوم ہوگا" ابا جان نے جواب دیا۔

اسی وقت کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ اندر سے کھٹ کھٹایا۔ میں بھاگ کر ادھر گیا تو دروازے کے پیچھے امی جان کھڑی تھیں۔ وہ کہنے لگیں "بیٹا، اپنے ابو کو بتا دو کہ میں نے گھر کی سب چیزیں دیکھ لی ہیں۔ اللہ کے فضل سے وہ ایک سوئی بھی چوری نہیں کرسکا۔"

میں نے جب باہر نکل کر ابا جان کو یہ خوش خبری سنائی تو انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "وہ چوری تھوڑی کرنے آیا تھا، وہ تو تمہارے چھوٹے بھائی کو سائیکل دینے آیا تھا۔ شاید اسے پتا چل گیا تھا کہ تمہارا چھوٹا بھائی تمہاری نئی سائیکل چلانے کی ضد کرتا ہے۔"

"ابو، یہ سائیکل چور دے گیا ہے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وہ سائیکل دے نہیں گیا، اسے سائیکل چھوڑنا پڑی ہے۔ تمہارے چور چور کہنے سے وہ ڈر کے بھاگا، اور جب ہم نے اس کا پیچھا کیا تو اسے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ جس سائیکل پر وہ چوری کرنے کے لئے آیا تھا اسے واپس لے جاتا۔ اب تم اسے بھاگتے چور کی لنگوٹی سمجھو" میرے بڑے بھائی نے کہا۔

"واہ! چور بھائی۔ آپ کا شکریہ۔ آپ نے سائیکل عنایت فرمائی" میرے چھوٹے بھائی نے کہا اور سائیکل لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ میرے گھر آنے پر میری امی نے مجھے بتایا کہ چور نے ایک تو میرے کمرے کا تالا کھولا تھا اور دوسرا اس کمرے کو باہر سے کنڈی لگا دی تھی جس میں تمہاری خالہ جان اور ان کے بچّے سوئے ہوئے تھے۔

****

ایک لڑکے نے، جو ہاسٹل میں رہتا تھا، اپنے والد کو خط لکھا: جناب قبلہ و کعبہ والدِ صاحب، السّلامُ علیکُم۔ ڈیڑھ ماہ سے آپ کی خیریّت معلوم نہیں ہوئی۔ براہِ مہربانی میرا خرچہ بھیج دیں تاکہ آپ کی خیریّت معلوم ہو سکے۔

کسی نے میرزا غالب سے دریافت کیا کہ بچھّو سردیوں کے موسم میں باہر کیوں نہیں نکلتے۔ غالب نے کہا "گرمیوں میں اِن بے چاروں کی کون سی عزّت ہوتی ہے جو وہ سردیوں میں باہر نکلیں۔ (محمّد سعید رضا خاکوانی، بورے والا)

بیٹا (باپ سے): ابّو، آپ مجھ سے بالکُل محبّت نہیں کرتے۔ پڑوس والے انکل اپنے بیٹے کو چاند اور تارا کہہ کر بُلاتے ہیں، اور آپ مجھے گدھا اور اُلّو کہتے ہیں۔

باپ: بیٹا، وہ ماہرِ فلکیات ہیں جب کہ میں ڈنگر ڈاکٹر ہوں۔ (شیخ کاشِف علی عبّاس، میرپور آزاد کشمیر)

فیصل (ہارون سے): میرے بھائی کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

ہارون: کیوں؟ کیا وہ بہت طاقت ور ہیں؟

فیصل: نہیں۔ وہ گنجے ہیں۔ (احمد عثمان چغتائی، ٹاؤن شپ لاہور)

بیوی (شوہر سے): اگر گھر میں، خُدانخواستہ، ڈاکو گھُس آئیں تو آپ کیا کریں گے؟

شوہر: جو وہ کہیں گے، وہی کروں گا۔ کیوں کہ اب تک اِس گھر میں مجھے اپنی مرضی سے کچھ کرنا نصیب نہیں ہوا۔ (اِعجاز اکرم، بہاول پور)

ایک خاتون نے ایک کیک خریدا۔ بیکری والے نے چھُری اُٹھاتے ہوئے پُوچھا "چھ ٹکڑے کروں یا آٹھ؟

"چار کریں۔ آج کل میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں" خاتون نے جواب دیا۔ (طُوبیٰ سعدیہ، ماڈل ٹاؤن لاہور)

بیوی (شوہر سے): آپ کو تو میرا بنایا ہوا حلوا اچھا ہی نہیں لگتا۔ بچّے تو تین پلیٹیں ختم کر چکے ہیں۔

اندر سے ایک بچّے کی آواز آئی "امّی، ایک پلیٹ اور دیں۔ دو کتابیں رہ گئی ہیں جوڑنے والی"۔ (نادیہ ظہیر، اِسلام آباد)

لاہور میں کرائے کے مکانوں کی بہت قِلّت ہے۔

پرویز صاحِب نے میاں عزیز کو دریائے راوی میں ڈوبتے دیکھا تو بھاگتے ہوئے مالکِ مکان کے پاس گئے اور بولے "یہ مکان مجھے کرائے پر دے دیجئے۔ یہ لیجئے کرایہ۔"

"مگر میرا مکان تو کرائے پر دیا جا چکا ہے" مالکِ مکان نے جواب دیا۔

"دیا جا چکا تھا" پرویز صاحِب بولے "میں اپنی آنکھوں سے میاں عزیز کو راوی میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر آرہا ہوں۔"

"دیا جا چکا ہے" مالک مکان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "مرزا مجید اُسے کرائے پر لے چکے ہیں۔ وہ میاں عزیز کو دریا میں دھکّا دیتے ہی میرے پاس پہنچ گئے تھے۔" (طاہر محمود، وجھ ضلع سرگودھا)

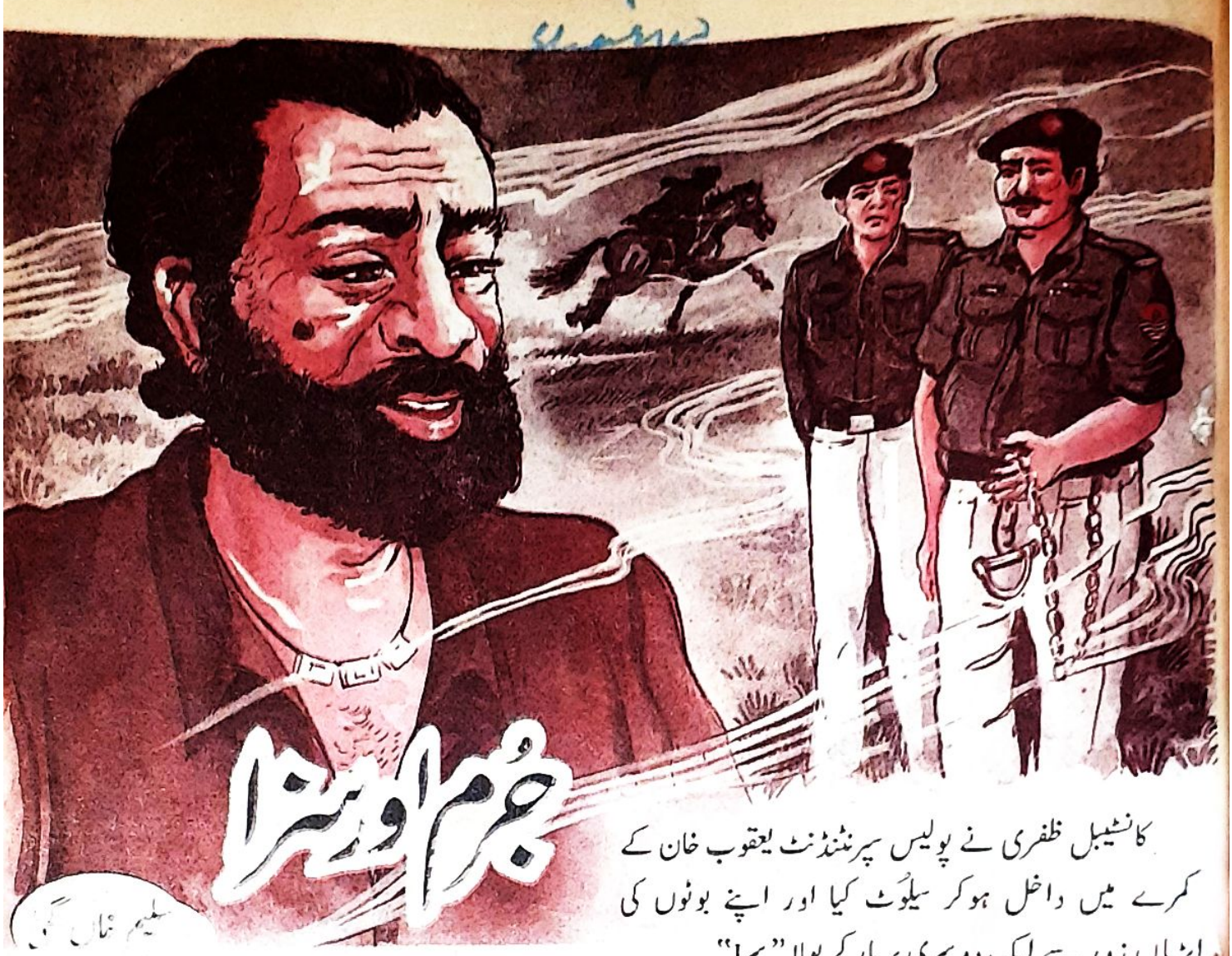

جرم اور سزا

سلیم خاں گمی

کانسٹیبل ظفری نے پولیس سپرنٹنڈنٹ یعقوب خان کے کمرے میں داخل ہوکر سیلوٹ کیا اور اپنے بوٹوں کی ایڑیاں زور سے ایک دوسری پر مار کر بولا "سر!"

"تم اِشتہاری مُلزم آصف عُرف کالو پہلوان کو زندہ یا مُردہ پکڑو گے۔ تمہاری مدد کے لئے اسسٹنٹ سب اِنسپکٹر منظور چھُرا تمہارے ساتھ ہوگا" یعقوب خان نے کہا۔

"سر، منظور چھُرا میرے والدِ ثمر علی سب اِنسپکٹر کا قاتل ہے۔ میں اُس کے ساتھ ڈیوٹی ٹھیک طریقے سے انجام نہیں دے سکوں گا" ظفری نے کہا۔

"وہ تمہارے والد کا قاتل نہیں ہے۔ اُس کا قاتل آصف عُرف کالو پہلوان ہے۔ اُسی کی گولی سے ثمر علی ہلاک ہوا تھا" ایس پی نے کہا۔

"نہیں، سر۔ منظور چھُرے نے میرے والد پر فائر کیا تھا، کالو پہلوان نے نہیں۔"

"میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ کالو پہلوان کو پکڑنے کے لئے تم سے بہتر سپاہی میرے پاس نہیں ہے۔ میرا حکم مانو یا نوکری چھوڑ کر گھر چلے جاؤ" ایس پی یعقوب خان نے سختی سے کہا۔

"نوکری کروں گا، سر" ظفری نے کہا۔ یہ کہہ کر اُس نے ایس پی یعقوب خان کو سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔

ظفری باہر آیا تو اسسٹنٹ سب انسپکٹر منظور چھُرا ایس پی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بھی ظفری کی طرح ایس پی کو سلام کیا اور تن کر کھڑا ہوگیا۔

"تم آصف عرف کالو پہلوان کو پکڑنے کے لئے جاؤ گے۔ تمہارے ساتھ کانسٹیبل ظفری ہوگا جو سب انسپکٹر ثمر علی کا بیٹا ہے۔ تم اس کو خوب جانتے ہو۔ وہ باپ کی طرح دِلیر، بہادُر اور نِڈر ہے" ایس پی صاحب نے کہا۔

"وہ مجھے اپنے والد کا قاتل سمجھتا ہے" منظور چھُرا بولا۔

"ہاں، سمجھتا ہے۔ لیکن غلط سمجھتا ہے۔ تم نے اُسے

قتل نہیں کیا تھا' کالو پہلوان نے کیا تھا" ایس پی صاحب بولے۔

"لیکن ظفری مجھے ہی اپنے والد کا قاتل سمجھتا ہے۔ اسے مہربانی کرکے میرے ساتھ نہ بھیجئے۔ وہ مجھے موقع پاکر قتل کردے گا" منظور چھُرا بولا۔

"میں نے اسے بتادیا ہے' سمجھا دیا ہے کہ تم اس کے والد کے قاتل نہیں ہو' کالُو قاتل ہے۔ اور اس نے میری بات پر یقین کرلیا ہے۔"

"سر' مجھے یقین نہیں ہے کہ اس نے آپ کی بات کا یقین کیا ہے۔ وہ اِنتہائی ٹیڑھا آدمی ہے' باپ کی طرح۔"

"ثمر علی ٹیڑھا نہیں تھا۔ بہادُر' دِلیر اور نڈر افسر تھا۔ ڈیوٹی دیتے ہوئے ہلاک ہوا۔ اسے اب ٹیڑھا نہیں کہنا چاہئے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

منظور چُھرے نے سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔ اب ہیڈ کانسٹیبل چودھری نثار کی باری تھی۔ اس نے بھی ظفری کانسٹیبل اور منظور چُھرے کی طرح ایس پی کو سلام کیا اور اٹن شن کھڑا ہوگیا۔

"تم چھرے اور ظفری کے ساتھ جاؤ گے اور کالو پہلوان کو زندہ یا مُردہ پکڑ کر لاؤ گے۔ وہ بہت خطرناک بدمعاش ہے۔ اس نے دو آدمیوں کو اِغوا کیا اور پھر قتل کردیا۔ وہ ہمارے ایک سب انسپکٹر ثمر علی کو بھی قتل کرچکا ہے" ایس پی صاحب نے کہا۔

"سر' وہ تو منظور چُھرے کی گولی سے مرا تھا" چودھری نثار نے کہا۔

"یہ دُرُست نہیں ہے۔ ثمر علی کی موت کالو پہلوان کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہے۔ اور اب یہی بات سچ ہے۔ سمجھے؟"

"یس سر' سمجھ گیا" چودھری نثار نے ادب سے کہا۔

"کالو پہلوان کو چُھرا اور ظفری پکڑیں گے۔ دونوں کالو سے نفرت کرتے ہیں" ایس پی صاحب بولے۔

"دونوں ایک دوسرے سے بھی نفرت کرتے ہیں' سر" چودھری نثار بولا۔

"اِسی لئے تمہیں اُن کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تم اُن دونوں کو لڑنے بھڑنے نہیں دو گے۔ دونوں پر نگاہ رکھو گے تاکہ وہ ایک دوسرے سے خوش اخلاقی سے پیش آئیں" ایس پی صاحب بولے۔

"یس' سر۔ لیکن چُھرا کالُو پہلوان سے کیوں نفرت کرتا ہے؟" چودھری نثار نے پوچھا۔

"پولیس کے ساتھ ایک مقابلے میں کالو نے چھرے پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے چھرا بچ گیا۔"

"یس سر" چودھری نثار بولا۔

"اب جاؤ اور ان دونوں کے ساتھ کالو پہلوان کی تلاش میں نکل جاؤ۔"

وہ تینوں سی۔ آئی۔ اے اسٹاف کے آفس سے ہتھیار اور کپڑے لے کر باہر سڑک پر آگئے۔ چودھری نثار نے ایک ٹیکسی روکی۔ تینوں اس میں بیٹھے اور بادامی باغ لاہور کے بسوں کے اڈّے کی طرف چل دیئے۔ شکر گڑھ کی بس تیاّر کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ گئے۔ ایک طرف چُھرا' دوسری طرف ظفری اور درمیان میں چودھری نثار۔ وہ دس بجے چلے تھے اور ساڑھے بارہ بجے بعد دوپہر شکر گڑھ پہنچ گئے۔ ایک بجے کھانا کھایا اور پھر کار لے کر سہ پہر کو تھانہ سکھو چک شمال پہنچ گئے۔

خیال یہ تھا کہ کالو پہلوان تھانہ سکھو چک شمال کی حُدود کے اندر کسی گاؤں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ خبر اس کے ایک ایسے ساتھی نے دی تھی جو اب جرائم کی دنیا سے الگ ہوکر پولیس کا مخبر بن چکا تھا۔ لیکن آصف عرف کالو پہلوان کو اِس کا علم نہ تھا۔

چودھری نثار شام کو تھانے کے ہیڈ مُحرّر نذیر علی سے ملا' اس کے ساتھ اس نے کھانا کھایا اور اس کے بچّے کو ایک سو روپیہ دیا' کیوں کہ وہ خالی ہاتھ آیا تھا۔ بچّے کے لئے مٹھائی وغیرہ نہیں لایا تھا۔

نذیر علی کو معلوم تھا کہ چودھری نثار اور اس کے

ساتھی کیوں آئے ہیں۔ وہ بولا "ایک شام ایک چھ فٹ لمبا آدمی آیا تھا' تھانے دار صاحب سے ملنے کے لئے۔ اس کا جسم کسرتی تھا۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ کان کُچلے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں' جیسے اندھے چوہے کی ہوتی ہیں۔ ہاتھ بڑے بڑے تھے' جیسے اینٹیں بنانے والے پتھیروں کے ہوتے ہیں۔ اُوپر کے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا" نذیر علی فر فر بول رہا تھا۔

"وہ آصف عُرف کالو پہلوان تھا' تین آدمیوں کا قاتل جن میں ایک سب انسپکٹر شمر علی بھی ہے" چودھری نثار نے کہا۔

"تھانیدار ہمیں نہیں بتائے گا۔ اگر بتائے گا بھی تو غلط۔ وہ کالو سے دس پندرہ ہزار روپے وصول کرچکا ہے" چودھری نثار نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" نذیر علی بولا۔

"کتنے دن ہوئے دونوں کی ملاقات کو؟" چودھری نثار نے پوچھا۔

"پرسوں کی بات ہے' پرسوں شام کی بات۔"

"اُس کی ذات کیا ہے؟"

"مجھے کالو کی ذات کا عِلم نہیں" نذیر علی نے کہا۔

"وہ کھٹیک ہے۔ اِس ذات کے لوگ ہٹ کے پکّے ہوتے ہیں۔ محنتی ہوتے ہیں۔ سخت جان ہوتے ہیں۔ جس راہ پر چل پڑیں' مُڑتے نہیں ہیں۔ کتنے گاؤں ہیں کھٹیکوں کے تمہارے تھانے میں؟" چودھری نثار نے پوچھا۔

"گاؤں؟ گاؤں تو نہیں ہیں' تین چار دیہات میں اُن کے گھر ہیں" نذیر علی نے بتایا۔

"ان دیہات کے نام مل جائیں تو ہم کالو کا پتا کرسکتے ہیں۔" چودھری نثار نے کہا۔

"ضرور مل جائیں گے" ہیڈ مُحرّر نذیر علی نے کہا۔

جب ہیڈ کانسٹیبل نثار علی تھانے میں آیا تو معلوم ہوا کہ ان کے سونے کا انتظام شمال کے گاؤں کے نمبر دار سکندر خاں کی حویلی میں کردیا گیا ہے۔ وہ ایک کانسٹیبل کو لے کر نمبر دار کی حویلی پہنچا۔ ظفری اور چھُرا سو چکے تھے۔ نثار علی بھی چارپائی پر لیٹا اور سوگیا۔

وہ پوری طرح نہ سویا تھا کہ گھوڑے کے ہِن ہِنانے سے جاگ اٹھا۔ حویلی گاؤں سے باہر تھی اور اُس کے اِرد گِرد کوئی دوسری حویلی یا گھر نہ تھا۔ نمبردار کی حویلی میں بھی کوئی گھوڑا' گھوڑی' خچّر یا ٹٹّو نہ تھا۔

نثار علی نے ظفری اور چھُرے کو جگایا اور وہ تینوں اُٹھ کر حویلی کے صحن میں' امرود کے درخت کے نیچے' کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی حویلی کی دیوار پھاند کر اندر آئے اور کلاشنکوف کے بٹ مار کر باہر نکل گئے۔ اب دو گھوڑے ہنہناتے ہوئے سرپٹ بھاگ رہے تھے اور

شمال گاؤں کے شمال میں ریاست جموں کی طرف جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد نمبردار سکندر خاں اور تھانیدار کمال شاہ بھی آگئے اور ظفری' چودھری نثار اور چھرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حیران اس بات پر کہ وہ زندہ تھے!

ظفری نوجوان تھا اس لئے سخت تاؤ میں تھا۔ اس نے تھانیدار کمال شاہ کا گھوڑا دیکھا' اس کی لگام اس سے چھینی' اس پر بیٹھا اور اس طرف گھوڑے کو بگ ٹٹ بھگا دیا جدھر کالو پہلوان اور اس کے ساتھی گئے تھے۔ یہ جنگل کا راستہ تھا۔

منظور چھرا کب پیچھے رہنے والا تھا۔ اس نے نمبردار سکندر خاں کا گھوڑا چھینا اور اس طرف سرپٹ ڈال دیا جس طرف ظفری گیا تھا۔ چودھری نثار ہاتھ ملتا رہ گیا۔

"تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟" تھانیدار کمال شاہ نے کہا۔

"یہ دونوں ایک دوسرے کے بیری ہیں۔ ایک دوسرے کو مار ڈالیں گے" نثار نے کہا۔

" کیوں فضول بات کرتے ہو۔ وہ تو کالو پہلوان اور اس کے ساتھی کو پکڑنے گئے ہیں' خود لڑنے مرنے کے لئے نہیں" کمال شاہ بولا۔

"ان کی آپس میں دشمنی ہے" نثار نے دشمنی کے لفظ پر زور دے کر کہا۔

"یہ بات تھی تو انہیں اس مہم پر کیوں بھیجا گیا؟" نمبردار نے سوال کیا۔

"ایس پی یعقوب خان ان دونوں کو بہادر سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کالو ایسے خطرناک مجرم کو یہی دو آدمی پکڑ سکتے ہیں" نثار نے بتایا۔

"اگر یہ بات یعقوب خان سوچتا ہے تو درست سوچتا ہے۔ وہ بہت تجربہ کار اور ذہین پولیس افسر ہے" کمال شاہ نے کہا۔

"میں تو حیران ہوں کہ تم تینوں کالو پہلوان کے حملے سے بچ کیسے گئے۔" نمبردار سکندر خاں بولا۔

"میں نے کالو کے گھوڑے کو ہنہناتے ہوئے سن لیا تھا اور ہم تینوں اٹھ کر امرود کے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ دیوار پھاند کر آئے اور کلاشنکوف کے بسٹ مار کر بھاگ گئے۔ لیکن میں یہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں؟ مجھے بھی کوئی گھوڑا دو۔ میں بھی ان دونوں کا پیچھا کروں گا کہیں وہ آپس میں لڑ بھڑ کر ایک دوسرے کو ختم نہ کر دیں" چودھری نثار نے پریشان ہو کر کہا۔

"نمبردار، نثار کو فوراً ایک گھوڑا یا گھوڑی دو۔ میں پیدل تھانے جاؤں گا" کمال شاہ نے کہا اور چل دیا۔

جب چودھری نثار جنگل میں داخل ہوا تو اسے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر یہ آوازیں ایک دم ختم ہو گئیں۔ یہ پہاڑی کیکروں کا جنگل تھا اور اس میں کہیں کہیں سنبل کے درخت بھی تھے۔ پہاڑی کیکر ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے اور سنبل کے لمبے لمبے درخت ان کے بہت اوپر کھڑے تھے جن کے ہرے پتوں کے درمیان سرخ سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ جنگل جموں کی سرحد پر تھا۔

چودھری نثار آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ظفری پستول ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور منظور چھرا لہو میں لت پت زمین پر گرا پڑا ہے۔

"اب تم مرنے والے ہو' اس لئے جھوٹ نہ بولو" ظفری نے کہا۔

"نہیں۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ثمر علی کو میں نے گولی ماری تھی" چھرے نے رک رک کر کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"اس نے افسروں سے میری شکایت کی تھی کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ اس طرح میری ترقی رک گئی اور وہ خود مجھ سے پہلے سب انسپکٹر ہو گیا" منظور چھرے نے کہا۔

"ظفری' ہمیں چاہئے چھرے کو اٹھا کر شمال لے جائیں تاکہ اس کا علاج ہو سکے" چودھری نثار نے کہا۔ لیکن

چُھرا دم توڑ چکا تھا۔ نثار نے اسے ہلا کر دیکھا اور بولا :

"یہ مر چکا ہے۔ تم نے بہت بُرا کیا، ظفری۔ چُھرے کو کالو سے پہلے نہیں مرنا چاہئے تھا۔"

"گولی پہلے چھرے نے چلائی تھی، میں نے نہیں۔ لیکن میں خوش قسمتی سے بچ گیا اور وہ میری گولی سے نہ بچ سکا۔ عمر کی وجہ سے سُست ہوگیا تھا۔ گولی کی سیدھ کے سامنے کھڑا رہا۔ دائیں بائیں ہوکر یا جھک کر گولی کی مار سے نہ بچ سکا۔" ظفری نے خوش ہو کر کہا۔

چودھری نثار بولا "میں نمبردار کی گھوڑی پر چھرے کی لاش رکھ کر لے جاؤں گا اور کمال شاہ سے کہوں گا کہ کالو پہلوان کی گولی سے منظور چُھرا ہلاک ہوا ہے۔"

"مجھے اب یہ پروا نہیں کہ آپ کیا رپورٹ کریں

گے۔ میں نے اپنے والد کے قاتل کو قتل کیا ہے۔ اب کالو کو قتل کروں گا یا قتل ہو جاؤں گا" ظفری بولا۔

"اسے زندہ پکڑو۔ یوں اس سے بہت سی باتوں کا پتا چلے گا" یہ کہہ کر نثار نے چھرے کی لاش گھوڑی پر رکھی اور خود ظفری کے سہارے لاش کے پیچھے بیٹھ گیا۔

"اب تمہارے پاس دو گھوڑے ہیں۔ ایک نمبردار سکندر خاں کا اور ایک تھانیدار کمال شاہ کا" نثار نے جنگل سے روانہ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں" ظفری نے کہا اور کھانس کر زمین پر زور سے تھوک دیا۔ گرد و غبار سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا، دھوپ میں پڑی ہوئی مُشکیزی کی طرح ___ دُور سُنبل کے گُل نار پھولوں میں چُھپی بُلبُل چہچہا رہی تھی۔

ظفری نمبردار کے گھوڑے پر بیٹھا، لیکن بیٹھنے سے پہلے اس نے کمال شاہ کے گھوڑے کا رسّا نمبردار کے گھوڑے کی کاٹھی سے کس کر باندھ دیا۔ نمبردار کے گھوڑے میں نمبردار کی طرح نرمی اور شرافت تھی۔ تھانیدار کے گھوڑے میں تھانیدار کی طرح تیزی، طراری اور اکھڑپن تھا۔ اس لئے ظفری نے نمبردار کے گھوڑے پر بیٹھنا مناسب خیال کیا۔

وہ ساری دوپہر، سر نیچا کئے، پہاڑی کیکروں کی شاخوں سے بچتا ہوا شام سے پہلے ایک ندی کنارے پہنچا، جہاں پن چکّی چل رہی تھی اور ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی اپنی بھیڑ کو نہلا رہی تھی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" ظفری نے پوچھا۔

"یہ نکروٹہ ہے۔ تو کون ہے؟ گوجر یا کھٹیک؟ رانا یا ڈوگرا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"میں ظفری ہوں۔ شمال سے آیا ہوں" وہ بولا۔

"کیکر اور سنبل کا جنگل پار کرکے؟" لڑکی نے سوال کیا

"ہاں۔ کیکر اور سنبل کا جنگل پار کرکے، شمال سے آیا ہوں، کالو کی تلاش میں" ظفری نے بتایا۔

"میں اور میرا باپ نگروٹہ میں رہتے ہیں اور گاؤں کے لوگوں کی گندم پیس کر آٹا بناتے ہیں۔ باپ آٹا دینے گیا ہے' گاؤں میں ___ آتا ہی ہوگا" لڑکی مسلسل بول رہی تھی۔

"سُنو! مجھے بھوک لگی ہے اور میرے جانور بھی بھوکے ہیں" ظفری بولا۔

لڑکی نے کچھ نہ کہا' گندم کی بوری میں سے گندم لے کر گھوڑوں کے سامنے ڈال دی اور بولی "جب اِن کا پیٹ بھر جائے تو اِنہیں ندی سے پانی پلانا۔ دو دن تک اِن کو بھوک نہیں لگے گی۔ اور تم اُس انار کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ میں کھانا لاتی ہوں۔"

ظفری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لڑکی اندر گئی اور پیتل کے گلاس میں دودھ اور چھابی میں مکئی کی روٹی لے آئی۔

"لو' کھالو۔ دودھ میں شکر ڈالی ہے' اور مکئی کی روٹی بہت مزے دار ہے۔ ایک گھونٹ دودھ اور ایک نوالہ روٹی۔ دونوں میں بہت طاقت ہے" لڑکی نے کہا۔

دودھ کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے ظفری نے پوچھا "کالو اور اس کا ساتھی اِدھر آئے تھے؟"

"وہ کل رات ہمارے پاس تھے۔ صبح چلے گئے۔ پھر نہیں آئے۔ ان کو ایک آدمی بُلا کر لے گیا تھا۔ وہ رات کو آیا تھا" لڑکی نے کہا۔

"وہ کمال شاہ کا آدمی ہوگا" ظفری نے سوچا اور مکئی کی روٹی جلدی جلدی چبانے لگا۔

"آج ہے ہفتہ' کل اتوار' پرسوں پیر۔ کالو پیر کو اپنے بھائی صابر کے پاس جائے گا۔ صابر ہسپتال میں داخل ہے" لڑکی نے سادگی سے کہا۔

"یہ تم کیسے جانتی ہو؟" ظفری نے پوچھا۔

"وہ کل رات ہمارے پاس تھا ناں۔ اس نے بتایا تھا۔ وہ صابر کو بہت یاد کرتا تھا۔ صابر اس کا چھوٹا بھائی ہے اور نشہ کرتا ہے۔ پاؤڈر پیتا ہے" لڑکی نے کہا۔

ظفری کچھ نہ بولا۔ اس نے خالی گلاس خالی چھابی میں رکھا اور جیب میں سے سو کا نوٹ نکالا۔ پھر نوٹ گلاس کے پیندے کے نیچے رکھا اور لڑکی کو ہکّا بکّا چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

"میں اُلّو کا پٹھّا ہوں" ظفری نے کیکر اور سُنبل کا جنگل پار کرتے ہوئے کہا "مجھے کیوں خیال نہ آیا کہ کالو کا چھوٹا بھائی صابر ہیروئن پیتا ہے اور لاہور کے ایک ہسپتال میں داخل ہے' جہاں کالو اس کا علاج کرا رہا ہے۔ اس دنیا میں صابر کے علاوہ کالو کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔"

جب وہ تھانہ سکھو چک شمال پہنچا تو چودھری نثار چھرے کی لاش لے کر چک امرو ریلوے اسٹیشن جاچکا تھا۔ ظفری نے تھانیدار کا روزنامچہ پڑھا۔ لکھا تھا: اِشتہاری مُلزِم کالو پہلوان کے ساتھ مقابلے میں منظور چھُرا ہلاک ہوگیا۔" روزنامچے میں ظفری کا ذکر تک نہ تھا۔

ظفری نے نمبردار اور تھانیدار کے گھوڑے واپس کئے اور خود کرائے کے ٹٹو پر بیٹھ کر چک امرو ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

چودھری نثار منظور چھرے کی لاش لے کر گارڈ کے ڈبّے میں بیٹھا تھا۔ ظفری بھی وہیں بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی تو ظفری باہر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ٹرین کے آخری ڈبّے میں کوئی بھاگ کر چڑھا ہے۔ اِس شخص کو اُس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ ہاں' یاد آیا۔ اِس شخص کو اُس نے گوال منڈی لاہور کے تھانے کی حوالات میں دیکھا تھا۔ وہ وہاں اپنے والد ثمر علی سے ملنے گیا تھا۔ ارے! یہ تو کالو پہلوان تھا۔ اس کی یادداشت ایک دم جاگ اُٹھی۔

ظفری چلتی ریل گاڑی کی چھت پر چڑھ کر سب سے پچھلے ڈبّے کی طرف دوڑا۔ آخری ڈبّے کی چھت پر سے لٹک کر نیچے ڈبّے میں آیا اور کونے میں دبکے ہوئے کالو پر پستول سے فائر کیا۔ کالو چیتے کی سی چُستی سے چھلانگ لگا کر پرے ہوگیا اور پھر کھڑکی میں سے ٹرین کی چھت پر چڑھ گیا۔ ظفری بھی اس کے پیچھے لپکا۔

اب یوں ہوا کہ ٹرین بھاگ رہی تھی شکر گڑھ کی

طرف، کالو بھاگ رہا تھا انجن کی طرف اور ظفری بھاگ رہا تھا کالو پہلوان کے پیچھے۔ ٹرین کے ڈبّے لڑکھڑا رہے تھے۔ کالو بھاگتے ہوئے گرتا، سنبھلتا، اٹھتا اور پھر بھاگنا شروع کردیتا۔ یہی حال ظفری کا تھا۔ وہ بھی لڑکھڑاتا، سنبھلنے کی کوشش کرتا، گرتا، اٹھتا اور پھر کالو کے پیچھے بھاگنے لگتا۔

ٹرین سیدھے سبھاؤ شکر گڑھ کی طرف بھاگی جارہی تھی۔ راستے میں ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن آیا، لیکن ٹرین نہ رُکی۔ قریب پہنچ کر ظفری نے کالو کا نشانہ لیا لیکن وہ خطا گیا۔ کالو نے اُلٹا فائر کیا اور گولیاں تڑ تڑ کرتی ہوئی ظفری کے اوپر سے گزر گئیں۔ اس نے ٹرین کی چھت سے چھٹ کر جان بچائی اور اب چھت پر بیٹھ کر کالو کا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کی گولی کالو کا دایاں بازو چیر کر نکل گئی۔ کالو کے ہاتھ سے ریوالور گرا، ٹرین کی چھت سے ٹکرایا، لڑھکا اور پھر نیچے گر پڑا۔ کالو نے چھت پر بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ کھڑے کردیئے۔ اب ظفری نے اس کے بائیں بازو کا نشانہ لیا اور گولی چلادی۔ اس کا بایاں بازو پہلو میں لٹک گیا۔

شکر گڑھ ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کھڑی ہوئی تو ظفری نے سہارا دے کر ادھ موئے کالو کو نیچے اتارا اور گارڈ کے ڈبے میں منظور چھمرے کے ساتھ لٹا دیا۔

"میری جیب میں تین ہزار روپے ہیں۔ صابر کا مہینے بھر کا خرچ۔ وہ لے لو" کالو نے دھیمی آواز میں کہا۔

ظفری نے اس کی جیب میں سے تین ہزار روپے نکال کر اپنی جیب میں رکھے اور بولا "تم جیو یا مرو۔ میں صابر کا علاج بھائی سمجھ کر کرواؤں گا۔"

دل چسپ اور عجیب

☆ قُطبِ شمالی قطبِ جنُوبی سے 2,799 میٹر نیچا ہے۔

☆ انگریزوں نے 1428ء میں' جنگوں میں' توپ کا اِستعمال شروع کیا' اور جس انگریز نے پہلی بار توپ چلائی' وہ سالس بری کا چوتھا نوآب تھا۔ اِتفاق کی بات کہ یہی نوآب وہ پہلا انگریز تھا جو توپ کے گولے سے ہلاک ہوا۔

☆ بِلّی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی اندرونی آنکھ میں ایسے خلیے (Cells) ہوتے ہیں جو روشنی کو مُنعکِس کردیتے ہیں۔ (بِلّی کی آنکھیں چمکنے کے لئے تھوڑی سی روشنی ہونی ضروری ہے۔ بالکل گھُپ اندھیرے میں اس کی آنکھیں نہیں چمکیں گی)۔

☆ اٹلی کے شہر وینس (وے نِس) کو نہروں کا شہر کہتے ہیں۔ اِس شہر میں 175 نہریں ہیں۔ اِن نہروں کو وینس کے لوگ گلیاں کہتے ہیں اور کشتیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی نہر یا گلی گرینڈ کینال کہلاتی ہے۔

☆ امریکا کے ایک ریسٹورنٹ کے مالک' جِم مورین' نے اپنے مصنوعی دانت ہیروں کے بنوائے تھے۔ لوگ اُسے ڈائمنڈ جِم کہتے تھے۔

☆ جب انگلینڈ کی ملِکہ وکٹوریا کا اِنتقال ہوا تو اُس کے تابُوت پر 80,000 پونڈ کے پھول نچھاور کئے گئے۔

☆ ابی سینیا (جسے اب ایتھوپیا کہتے ہیں) افریقہ کا ایک ملک ہے۔ اس کے ایک بادشاہ' منے لک' کو مُجرموں کو پھانسی کے ذریعے ہلاک کرنے کا طریقہ اچھا نہ لگتا تھا' کیوں کہ اِس سے مرنے والے کو بہُت تکلیف ہوتی ہے۔ چُناں چہ اُس نے امریکا سے بجلی کی کُرسی منگوائی' جس پر مُجرِم کو بٹھا کر کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے' اور ایک سکنڈ میں اس کی جان نکل جاتی ہے۔ لیکن جب یہ کرسی آئی تو بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اس کے ملک میں تو بجلی ہی نہیں ہے!

☆ دنیا میں' ہر سال' ایک لاکھ سے زیادہ زلزلے آتے ہیں' جن کے جھٹکے لوگوں کو محسوس ہوتے ہیں۔ اِن کے عِلاوہ' ہر سال' لاکھوں ایسے زلزلے آتے ہیں جن کا لوگوں کو اِحساس نہیں ہوتا۔ اِن کا پتا صرف زلزلہ پیما مشین ہی لگاتی ہے۔

☆ دنیا کا پہلا انسان جس نے بائیسکل پر دنیا کا چکّر لگایا' امریکا کا ایک شخص' تھا مَس اسٹی ونیز' تھا۔ وہ 1884ء میں امریکا کے شہر "سان فرانسِس کو" سے روانہ ہوا اور پوری دنیا کا چکّر لگا کر 1887ء میں واپس آگیا۔

☆ چودھویں صدی سے سولھویں صدی تک انگریز 24 گھنٹوں میں صرف دو دفعہ کھانا کھاتے تھے۔ تیسری دفعہ کھانا خلافِ قانون تھا۔ اس زمانے میں انگلینڈ میں خوراک کی شدید قِلّت تھی۔

☆ سوئٹزرلینڈ میں 1971ء تک عورتوں کو اِنتخابات میں ووٹ دینے کی اِجازت نہ تھی۔

☆ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے' شِمال مغربی افریقہ کے شہر کارتھیج (قرطاجنہ) کے لوگوں نے وہ علاقہ فتح کیا جہاں اب اسپین کا ملک آباد ہے تو اُنہوں نے اُس کا نام "اسپانیا" رکھا۔ اسپانیا کا مطلب ہے' خرگوشوں کا ملک۔

☆ انگلینڈ کے ایک بادشاہ' جارج سوم' کو کھیتی باڑی سے بہُت دل چسپی تھی۔ اُس کے اپنے بہُت سے کھیت تھے' جس میں وہ مختلف اناج اور سبزیاں اُگایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے ایک کھیت میں گائے کا گوشت

بودیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اناج کی طرح اِس گوشت میں سے بھی گوشت اُگے گا۔

☆ 1880ء میں امریکا کی ایک ریاست اوہائیو کی ایک گائے نے سیاہ رنگ کا دودھ دینا شروع کردیا۔ امریکی سائنس دانوں نے بہُت کوشش کی مگر کوئی بھی اِس کی وجہ نہ بتاسکا۔ دودھ کا صرف رنگ کالا تھا' باقی تمام خصُوصیات عام سفید دودھ جیسی تھیں۔

☆ انگلینڈ کی ملِکہ الزبتھ اوّل کے دانت میں کیڑا لگ گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ دانت نکالنا پڑے گا۔ ملکہ دانت نکلوانے سے ڈرتی تھی۔ اُس نے اِنکار کردیا۔ اِس پر لندن کے بڑے پادری' تھامَس آئل مر' نے ملکہ کے سامنے ڈاکٹر سے اپنا اچھّا بھلا دانت نکلوایا' اور جب ملکہ نے دیکھا کہ پادری کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی تو وہ دانت نکلوانے پر راضی ہوگئی۔

☆ 1924ء میں امریکا کا ایک بہُت خطرناک ڈاکو' ڈائیون او بے نین' پولیس کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا تو اُس کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی۔ اُس کی قبر پر جو پھول چڑھائے گئے وہ 26 ٹرکوں میں لاد کر لائے گئے تھے اور اُن کی قیمت 50,000 ڈالر تھی۔ (امریکیوں کا بھی جواب نہیں!)

☆ شکاری پرندے (عُقاب' باز' شِکرہ) صرف اُسی وقت شکار کرتے ہیں جب بہت بھوکے ہوں۔ جب اُن کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ کئی روز تک شکار نہیں کرتے۔

☆ ایک افریقی ہاتھی کا وزن 80 یا 90 آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔ نیلی وہیل 1800 سے 1900 آدمیوں کے برابر وزنی ہوتی ہے۔

☆ ایک چیونٹی اپنے وزن سے 50 گُنا زیادہ وزن اُٹھا سکتی ہے۔ ہم (اِنسان) مُشکِل سے اپنے وزن کے برابر بوجھ اُٹھا سکتے ہیں۔

☆ فلورنس نائٹنگل (جسے جدید نرسِنگ کا بانی کہا جاتا ہے) نے ایک اُلّو پالا تھا جسے وہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھتی تھی۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ اِستعمال ہونے والی سبزی پیاز ہے۔

☆ فرانس کا بادشاہ نپولین بوناپارٹ' جس نے آدھے سے زیادہ یورپ کو فتح کرلیا تھا' بلّیوں سے ڈرتا تھا۔

☆ انگلینڈ کی ملِکہ الزبتھ اوّل مہینے میں ایک دفعہ نہاتی تھی۔ ملکہ وکٹوریا سال میں ایک مرتبہ غسل کرتی تھی۔ اُس زمانے کے بہُت سے انگریز زندگی میں صرف ایک دفعہ نہاتے تھے۔

☆ ایک امریکی کروڑ پتی' جیمز گورڈن' مانٹے کارلو کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا کرتا تھا' اور ہمیشہ ایک مخصوص ٹیبل پر ہی بیٹھتا تھا۔ ایک دن اُس نے دیکھا کہ اُس کی ٹیبل پر کوئی اور شخص کھانا کھا رہا ہے۔ اُس نے ریسٹورنٹ کے مالک سے کہا کہ میں تمہارا ریسٹورنٹ خریدنا چاہتا ہوں۔ مانگو' کیا مانگتے ہو؟

ریسٹورنٹ کے مالک نے بڑھا چڑھا کر قیمت بتائی۔ جیمز گورڈن نے اُسی وقت چیک کاٹ کر اُسے دے دیا۔ اِس کے بعد اُس نے اُس شخص کو ریسٹورنٹ سے نکال دیا جو اُس کی میز پر کھانا کھا رہا تھا' اور خود وہاں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اُس نے وہ ریسٹورنٹ اُس بیرے کو بطور بخشیش دے دیا جس نے اُس کی میز پر کھانا لگایا تھا۔

☆ ناروے کے شِمالی علاقے میں 13 مئی سے 31 جولائی تک سورج غروب نہیں ہوتا۔ اِن دنوں آپ رات کو بھی سُورج دیکھ سکتے ہیں۔ (س-ل)

باتیں بڑوں کی

مرسلہ : مثیل بُخاری، بھکر

- لالچ، کنجوسی اور اِیمان کبھی ایک دِل میں جمع نہیں ہوسکتے۔ (حضرت محمدؐ ﷺ)

مرسلہ : ثناء افضل، سرگودھا

- اللہ تعالیٰ کو دو قطرے اور دو قدم بہُت محبوب ہیں۔ ایک آنسو کا وہ قطرہ جو اللہ کی راہ میں ٹپکے۔ دوسرا خون کا وہ قطرہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے گرے۔ ایک وہ قدم جو جہاد کے لئے اُٹھے اور دوسرا وہ جو اللہ کے فرائض میں سے کسی فرض کو ادا کرنے کے لئے اُٹھے۔ (حضرت محمدؐ ﷺ)

مرسلہ : حفیظُ اللہ طارق، کمالیہ

- اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جو زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے۔ (حضرت محمدؐ ﷺ)

مرسلہ : وقار فرید جگنُو، پاک پتن

- تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھّا ہے۔ (رسولُ اللہ ﷺ)

مرسلہ : وسیم مقصود کاشمیری، لاہور

- پڑوسی کو ستانے والا دوزخی ہے، اگرچہ تمام رات عبادت کرے اور تمام دن روزہ دار رہے۔ (حضرت محمدؐ ﷺ)

مرسلہ : صدف اِفتخار، لاہور

- جو لوگ زندگی کو ایک مُقدّس فریضہ سمجھ کر بسر کرتے ہیں، وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ (حضرت داؤد علیہ السّلام)

مرسلہ : سعدیہ شہزاد، ساہی وال

- عقل مند وہ ہے جو دوسروں کی نصیحتیں سُنتا ہے۔ (حضرت سلیمانؑ)
- خاموشی غصّے کا بہترین علاج ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
- تین چیزیں مَحبّت بڑھانے کا ذریعہ ہیں (1) سلام کرنا (2) دوسروں کے لئے مجلس میں جگہ خالی کرنا۔ (3) کسی کو بہترین نام سے پکارنا۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

مرسلہ : چودھری شاہد مشتاق چک نمبر L-116/15 میاں چنّوں

- ظالم کو مُعاف نہ کرو، کیوں کہ یہ مظلوموں پر ظُلم کرنا ہے۔ (حضرت عمرؓ)

مرسلہ : ثمینہ سعید مُغل، رائے وِنڈ

- حاسِد تمہاری خوشی سے غم گین ہوتا ہے۔ اِس کے لئے یہی کافی ہے۔ تمہیں اِنتقام لینے کی ضرورت نہیں۔ (حضرت عثمانؓ)
- سب کو خوش رکھنا بہُت مشکل ہے۔ اس لئے بس خدا سے اپنا مُعاملہ صاف رکھو اور کسی کی بے جا خوشی و ناخوشی کی پروا نہ کرو۔ (حضرت امام شافعیؒ)

مرسلہ : سیّد عِرفان حیدر، سندھ

- ساری رات جاگنے والے عبادت گزار سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنی رات کا کچھ حصّہ عِلم حاصل کرنے میں گزارے۔ (حضرت عبدُاللہ بن عبّاسؓ)
- جو بُرے کام کرنے سے ڈرے، وہ سب سے بڑا بہادُر ہے۔ (کارلائل)

مرسلہ : جویریہ حسن، اٹک

- زبان کی لغزِش پاؤں کی لغزِش سے زیادہ خطرناک ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

مرسلہ : صائمہ بتول، کالا گوجراں

- عقل مند کہتا ہے، میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن بے وقوف کہتا ہے، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ (حضرت عثمان غنیؓ)

✿ سب سے زیادہ جاہل وہ ہے جو گناہ سے باخبر ہوتے ہوئے بھی گناہ کرتا ہے۔ (امام شافعیؒ)

مرسلہ : سہیل اصغر راجا، موہری شریف

✿ کسی کو اپنے سے کم تر سمجھنا سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ : اویس مظہر، لاہور

✿ دُنیا میں اِس طرح زندہ رہو کہ جب تم زندہ رہو تو لوگ تم سے ملنے کے لئے بے قرار رہیں اور جب مر جاؤ تو تمہاری یاد میں آنسو بہائیں۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ : غلام محمّد بٹ، وزیر آباد

✿ لالچ ساری بُرائیوں کی جڑ اور عِلم تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ (حضرت علیؓ)

✿ تمہارے ساتھ کوئی نیکی کرے یا بدی، تم ہر ایک کے ساتھ اِحسان کرو۔ (امام ابو حنیفہؒ)

مرسلہ : غلام فاطمہ، چک لالہ راول پنڈی

✿ کسی پر اِحسان کرو تو اُس کو چُھپاؤ اور اگر تم پر کوئی اِحسان کرے تو اُسے ظاہر کرو۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ : سعدیہ شہزاد، ساہی وال

✿ دانا بولنے سے پہلے سوچتا ہے اور بے وقوف بولنے کے بعد سوچتا ہے۔ (حضرت حسن بصریؒ)

✿ اگر کام یابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو مسلسل محنت کرتے رہو۔ (جلال الدّین رومیؒ)

مرسلہ : غلام سُبحانی ٹورو، بستی نادعلی شاہ

✿ زیادہ خوش حالی اور زیادہ بدحالی، دونوں بُرائی کی طرف لے جاتے ہیں۔ (بُوعلی سینا)

✿ تین چیزیں انسان کو برباد کردیتی ہیں: حسد، حرص اور غرور۔ (شیخ سعدیؒ)

مرسلہ : نجمہ نجیب، فیصل آباد

✿ بلند حوصلہ انسان کے ہاتھوں میں آکر مٹّی بھی سونا بن جاتی ہے۔ (حضرت لقمان)

مرسلہ : شاہد محمود ذوالفقار، شکردرہ

✿ شیر سے پنجہ آزمائی کرنا اور تلوار پر مکا مارنا، عقل مندوں کا کام نہیں۔ (شیخ سعدیؒ)

✿ میں تو خوش رہتا ہوں، کیوں کہ میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ (آئن سٹائن)

✿ جب تک اِنسان عِلم سیکھتا رہتا ہے، وہ عالم رہتا ہے۔ لیکن جب اُسے یہ خیال آجائے کہ میں علم سیکھ چکا ہوں تو وہ جاہل بن جاتا ہے۔ (ابُو نصر فارابی)

مرسلہ : ایم عالم ملک، سانگھڑ

✿ دل کی سب سے بڑی بیماری حسد ہے۔ (امام غزالیؒ)

مرسلہ : راجا عدیل آصف، اسلام آباد

✿ کسی سے بدلہ لینے میں جلدی نہ کرو، اور کسی کے ساتھ نیکی کرنے میں تاخیر نہ کرو۔ (شفیق بلخی)

✿ اگر کچھ بننا چاہتے ہو تو ایک لمحہ بھی فضول ضائع نہ کرو۔ (قائدِاعظمؒ)

✿ دولت کے بھوکے کو کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ (معروف کرخیؒ)

مرسلہ : دانش اِحسان خان، مورگاہ راول پنڈی

✿ ہر نئی چیز اچھّی معلوم ہوتی ہے، مگر دوستی جتنی زیادہ پُرانی ہو، اُتنی ہی عُمدہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ (ارسطو)

مرسلہ : عالیہ کنول (مقام نامعلوم)

✿ کسی کا دل نہ دُکھا کیوں کہ تُو بھی دل رکھتا ہے۔ (ٹالسٹائی)

✿ اچھّی چیز حاصل کرنا بُرائی نہیں بلکہ اُسے اچھّی طرح اِستعمال نہ کرنا بُرائی ہے۔ (ڈاکٹر سموئیل جان سن)

مرسلہ : عدیل حُسین، ٹیکسلا

✿ بات کو پہلے دیر تک سوچو، پھر مُنہ سے نکالو، اور پھر اُس پر عمل کرو۔ (افلاطون)

مرسلہ : فضل بادشاہ، پشتون گڑھی

✿ اپنی بلندی کا اندازہ نیچے دیکھ کر ہوتا ہے، اُوپر دیکھ کر نہیں۔ (ایس۔ کے۔ لارنس)

آپ بھی لکھیے

اونچے خواب

نادیہ الیاس، قادر کالونی گجرات

ماسٹر فضلو ہمارے گاؤں کے اِکلوتے استاد تھے۔ اُن کا ایک ہی بیٹا تھا، جس کا نام کمالُ الدّین تھا لیکن لوگ اُسے کمّو کہتے تھے۔ وہ بہت لائق تھا۔ ماسٹر فضلو کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے۔ پھر ان کے پاس بہت سا پیسہ آجائے گا اور وہ شہر میں ایک شان دار کوٹھی بنائیں گے۔

جب اُن کے بیٹے نے مڈل پاس کرلیا تو انھوں نے اسے شہر کے ہائی اسکول میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ ان کی کچھ زمین تھی جسے بیچ کر وہ بیٹے کے تعلیمی اِخراجات پورے کرتے تھے۔

کمّو نے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تو ماسٹر فضلو کو اپنا خواب سچا ہوتا نظر آیا۔ اور اس وقت تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب کمو نے ایف ایس سی میں شان دار نمبر حاصل کئے اور اسے انجینئرنگ یونی ورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ ماسٹر فضلو نے سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی۔ ہر کوئی ماسٹر کو مبارک باد دے رہا تھا۔

دن، مہینے اور سال گزرتے گئے۔ کمو انجینئر بن گیا۔ لیکن گاؤں والوں نے محسوس کیا کہ ماسٹر فضلو کے تیور بدلتے جارہے ہیں۔ اب تو وہ کسی سے زیادہ بات بھی نہیں کرتے تھے۔ بس ہر وقت اپنی ہی اکڑ میں رہتے تھے۔ اور تو اور، اب ان کی بیوی ماسی نذیراں بھی بدل گئی تھی۔ وہ بھی کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ہر وقت کوٹھی، کار، نوکر چاکر اور روپے پیسے کے خوابوں میں کھوئے رہتے تھے۔

ایک دن ماسی نذیراں ماسٹر فضلو سے بولی "اے کمو کے ابا، تم مجھے ہر وقت دولت کے خواب سناتے رہتے ہو۔ بتاؤ تو سہی کہ ہمارے پاس کب دولت آئے گی؟ میرا تو اب اس گاؤں میں دل نہیں لگتا۔ تم نے شہر کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ میرا دل کرتا ہے کہ اُڑ کر شہر چلی جاؤں۔"

ماسٹر فضلو بولے "بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد ہمارے بیٹے کو اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ اور پتا ہے کیا ملے گا؟"

ماسی اشتیاق سے بولی "کیا ملے گا؟"

"کوٹھی ملے گی، کار ملے گی، نوکر چاکر ملیں گے" ماسٹر فضلو بولے۔

"پھر تو میں بیگم صاحبہ بن جاؤں گی" ماسی اِترا کر بولی۔

وقت یوں ہی گزرتا گیا۔ ماسی اور ماسٹر فضلو کا دل گاؤں سے اُچاٹ ہوچکا تھا۔ وہ جلد از جلد شہر جانا چاہتے تھے۔

ایک دن ماسٹر فضلو کو کمّو کا خط ملا، جس میں اس نے لکھا تھا کہ ابّا جان، مجھے بڑی شان دار نوکری مل گئی ہے۔ اب آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ یہ خط کیا آیا، ماسٹر اور ماسی ہواؤں میں اُڑنے لگے۔ ماسٹر فضلو نے اپنے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر "ماسٹر فضلُ الدّین" کی تختی لگادی۔

چند روز بعد ماسٹر فضلو نے سوچا کہ میرا بیٹا اتنا بڑا افسر بن گیا ہے' اب مجھے نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب میں اتنے بڑے افسر کا باپ ہوں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ انہوں نے اکڑ میں آکر نوکری چھوڑ دی۔

لوگوں نے ماسٹر فضلو کو سمجھایا کہ اگر تم نوکری چھوڑ دو گے تو اِسکول کے بچّوں کا کیا بنے گا۔ گاؤں میں اور کوئی ماسٹر نہیں۔ بچّوں کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ کیا میں نے گاؤں کے بچوں کی تعلیم کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟ اب میں اتنے بڑے افسر کا باپ ہوں۔ اب میں یہ گھٹیا سی نوکری نہیں کروں گا" ماسٹر فضلو جو کہ اب ماسٹر فضل الدین بن چکے تھے' بگڑ کر بولے۔ ان کی اس بات سے سب گاؤں والے ان سے ناراض ہوگئے اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

ایک رات ماسٹر اور ماسی' اپنے گھر کی چھت پر' اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے کہ ماسی بولی "کمو کے ابا' ہمارا گھر کتنا چھوٹا ہے۔ اب تو اس میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

ماسٹر فضلو بولے "فکر نہ کرو۔ ہم شہر میں ایک شان دار مکان بنائیں گے اور اس میں اپنے لئے ایک بڑا سا کمرا بنائیں گے۔" ماسٹر نے اٹھ کر اپنی چارپائی ماسی کی چارپائی سے تھوڑی دور کھسکائی اور بولے "اتنا بڑا ہوگا ہمارا کمرا۔"

ماسی بولی "نہیں' یہ تو بہت چھوٹا ہے۔" یہ کہ کر ماسی نے بھی اپنی چارپائی ماسٹر کی چارپائی سے دور کھینچی اور بولی "اتنا بڑا ہوگا۔"

ماسٹر بولے "نہیں' اتنا بڑا۔" یہ کہ کر اُنہوں نے اپنی چارپائی اور پرے کِھسکالی۔ وہ دونوں یہی کرتے رہے اور پھر اچانک دھڑام دھڑام کی آوازیں آئیں۔ گاؤں والے شور سن کر بھاگے بھاگے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ماسی نذیراں صحن میں بے ہوش پڑی ہے۔ اور اس کے اوپر اس کی چارپائی گری ہوئی ہے۔ ماسی کو کافی چوٹ آئی تھی اور وہ ہائے ہائے کر رہی تھی۔

پھر اچانک کسی کو ماسٹر فضلو کا خیال آیا۔ وہ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے گھر کے پیچھے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ماسٹر جی کوڑے کے ڈھیر پر گرے ہوئے ہیں۔ اس نے ماسٹر جی کو اٹھایا' ان کے کپڑے جھاڑے اور سہارا دے کر ان کے گھر میں لایا۔ کچھ دیر بعد ماسی کو بھی ہوش آگیا۔ دونوں میاں بیوی گاؤں والوں کے اچھے سلوک کی وجہ سے بہت شرمندہ تھے۔

کچھ دنوں بعد ماسٹر فضلو کے بیٹے کا خط آیا' جس میں اس نے لکھا تھا:

"ابّا جان' آداب۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کون سی بات پہلے بتاؤں اور کون سی بعد میں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے ایک بہت اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ کچھ دنوں پہلے میری ایک بڑے افسر سے لڑائی ہوگئی تھی' جس کی وجہ سے مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔ اب میرے پاس نہ کوٹھی ہے نہ کار۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پریشان نہیں ہوں گے۔ اور آپ کو پیسوں کی بھی فکر نہیں ہوگی۔ کیوں کہ آپ تو خود کماتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تنخواہ سے اماں اور آپ کا ٹھیک ٹھاک گزارا ہوتا ہوگا۔ آپ کا بیٹا' کمالُ الدّین۔"

یہ خط پڑھ کر ماسٹر صاحِب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور ماسی نے رو رو کر برا حال کرلیا۔

ماسٹر فضلو بولے "آہ! وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے نوکری چھوڑی تھی۔ اب تو میں دوبارہ نوکری بھی نہیں کرسکتا۔ میری جگہ نیا ماسٹر آگیا ہے۔ اے کاش! میں غرور نہ کرتا۔ کاش! میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر خواب نہ دیکھتا۔ اب تو میں دھوبی کے کتے کی مانند ہوں۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ شہر جاسکتا ہوں اور نہ گاؤں میں رہ سکتا ہوں۔ کیوں کہ اب میں گاؤں میں رہ کر کروں گا کیا؟ میری ساری زمین کمو کی پڑھائی کی نذر ہوگئی ہے۔"

(پہلا اِنعام : 50 روپے کی کتابیں)

کراماتی تعویذ

عظیم اختر میمن، میرپور خاص

"اوہ! چچا جان۔ آپ کب آئے؟" میں گھر میں داخل ہوتے ہی چچا جان کے گلے لگ گیا۔

"بس بیٹا، ابھی ابھی آیا ہوں۔ آفس میں دو تین دن کی چھٹی تھی۔ اس لئے تم سے ملنے آگیا۔ آخر اس دنیا میں تمہارے سوا میرا ہے ہی کون۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا، چچا جان۔ آپ امی ابو سے ملے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ان سے ملا ہوں۔ انہوں نے تمہاری بڑی شکایت کی ہے"

"مم میری شکایت؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں بھئی، تمہاری شکایت۔ تمہارے امتحان ایک مہینے بعد ہیں اور تم غالباً کرکٹ کھیلنے گئے تھے" چچا جان نے میرے ہاتھ میں بلا دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس دفعہ پہلی پوزیشن لینے کا ارادہ نہیں؟ ہر سال پہلی پوزیشن آتی رہی ہے تمہاری۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، چچا جان، لیکن ہماری کلاس میں ایک بہت ذہین لڑکا، حامد، آگیا ہے۔ اس کے مقابلے میں میری پہلی پوزیشن آنا ناممکن ہے" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اگر تم محنت کرو گے تو ضرور کامیاب ہوگے" چچا جان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، چچا جان۔ شش ماہی امتحانوں میں میں نے بڑی محنت کی تھی، لیکن حامد مجھ سے نمبر لے گیا۔ پورے 100 نمبر زیادہ آئے تھے اس کے مجھ سے۔ اب میں نے ہمت ہار دی ہے" میں نے گردن ہلا کر کہا۔

"اچھا، شش ماہی امتحانوں سے پہلے تم کتنے گھنٹے پڑھتے تھے؟" چچا جان نے پوچھا۔

"دو ڈھائی گھنٹے پڑھتا تھا" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو، بیٹا۔ دو ڈھائی گھنٹے تو تم اس وقت بھی پڑھتے تھے، جب تمہاری کلاس میں تم سے زیادہ کوئی ذہین لڑکا نہ تھا۔ اب تو تمہیں اور زیادہ محنت کرنی ہوگی۔"

"بس، چچا جان۔ یہ میرے لئے بہت مشکل ہے" میں بولا۔

چچا جان نے مجھے بہت سمجھایا، لیکن میں تو بالکل ہمت ہار بیٹھا تھا۔ ان کی بات میری سمجھ میں کیسے آتی۔

چچا جان ہمارے ہاں تین دن رہ کر واپس کراچی جانے لگے تو انہوں نے مجھ سے کہا "بیٹا، میں تمہارے لئے ایک کراماتی تعویذ لایا ہوں۔ وہ میں تمہیں دینا بھول گیا تھا۔ بچپن میں میں بھی اس تعویذ کی کرامت سے پوزیشن لیا کرتا تھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تعویذ نکال کر مجھے دے دیا۔

"اوہ! چچا جان۔ آپ کی بڑی مہربانی" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن اس کی دو شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ جب تمہارا نتیجہ نکلے گا تو اس وقت تم اس تعویذ کو کھول کر پڑھو گے۔ اور دوسری یہ کہ تمہیں پانچ گھنٹے روزانہ پڑھنا ہوگا" چچا جان بولے۔

"ٹھیک ہے، چچا جان۔ مجھے آپ کی دونوں شرطیں منظور ہیں" میں نے کہا۔

پھر چچا جان کراچی چلے گئے۔ اور میں نے وہ کراماتی تعویذ گلے میں ڈال لیا۔ اب میں روز پانچ گھنٹے پڑھا کرتا تھا۔ ذہین تو میں پہلے ہی تھا، جب میں نے پانچ گھنٹے روز پڑھنا شروع کیا تو پندرہ بیس دنوں میں میں نے پورے کورس کی تیاری مکمل کرلی۔ لیکن چچا جان کی ہدایت تھی کہ کسی دن تم نے پانچ گھنٹے نہ پڑھا تو پوزیشن نہیں آئے گی۔ اس لئے میں نے یاد کیا ہوا پھر دوہرایا۔ آخر امتحان کے دن آگئے۔ میرے پرچے اتنے اچھے ہوئے تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ میں فسٹ آؤں گا۔

ایک مہینے بعد رزلٹ آؤٹ ہوا تو واقعی میں نے ساتویں جماعت میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ گھر جاکر میں نے امی ابو کو یہ خوش خبری سنائی اور اپنا انعام وصول کیا۔ اس کے بعد اپنے کمرے میں جاکر کراماتی تعویذ کھولا تو اس میں لکھا تھا "مجھے یقین ہے کہ تم نے میری ہدایتوں پر عمل کیا ہوگا اور تمہاری پہلی پوزیشن آئی ہوگی۔ بیٹا، اگر انسان

محنت اور ہمّت سے کام لے اور خدا پر بھروسا رکھے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کام یاب نہ ہو۔"

(دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

بدلہ

ضیاءُ الحسن بھٹہ، نوشہرہ چھاؤنی

مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ اُس وقت میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے دیہاتی اسکول میں یہ رواج تھا کہ جس لڑکے کو کسی لفظ کے معنی نہ آتے تو استاد صاحب اس کو کھڑا کردیتے اور دوسرے لڑکے سے پوچھتے۔ آخر جو لڑکا صحیح جواب دے دیتا وہ کھڑے ہوئے لڑکوں کی ناک پکڑ کر ان کے گالوں پر ایک چپت لگاتا۔

ہماری جماعت کا مانیٹر ایک ذہین لڑکا تھا اور وہی عموماً دوسرے لڑکوں کے چپت لگاتا تھا۔ لیکن اگر کبھی کبھار وہ کسی لفظ کے معنی بھول جاتا تو دوسرے لڑکے اس کا لحاظ کرتے اور اس کے ہلکی سی چپت لگاتے تاکہ دوسرے دن یہ ان کا بھی خیال کرے۔ لیکن وہ ظالم کبھی کسی کا خیال نہ کرتا اور ایسی کراری چپت لگاتا کہ لڑکے کی چیخ نکل جاتی۔

ایک دن خدا کی قدرت کہ مانیٹر کو ایک لفظ کے معنی نہ آئے۔ اس کے ساتھ چار پانچ لڑکے بھی کھڑے تھے۔ جب ماسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ اب میں نے ان سب لڑکوں کی ناک پکڑ کر ان کے ایک ایک چپت لگائی تھی اور پہلا نمبر مانیٹر کا تھا۔ وہ بالکل اطمینان سے کھڑا تھا، کیوں کہ اس کو معلوم تھا کہ میں اس کے ہلکی سی چپت لگاؤں گا۔

لیکن میرے دل میں اس کے خلاف انتقامی جذبہ تھا جس کو آج میں ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ناک پکڑ کر ایسی زور کی چپت لگائی کہ میری پانچوں انگلیاں اس کے گال پر جم گئیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس دن کے بعد اس نے کئی دفعہ لڑکوں کے منہ پر چپت لگائی لیکن کیا مجال کہ کسی کے زور سے ماری ہو۔ تمام لڑکے میرے اس کارنامے پر بہت خوش تھے۔ میں نے اس کو ایک ہی چپت سے احساس دلا دیا تھا کہ دوسروں کو مارنے سے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی کہ خود کو ہوتی ہے۔

(تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

تصویر کے دو رُخ

فرخ عبدُالقیوّم، قاسم آباد راولپنڈی

نادیہ اور ہما دو سہیلیاں تھیں۔ لیکن جب وہ آٹھویں جماعت میں پہنچیں تو ایک لڑکی نائلہ نے ان کی دوستی اپنی چالاکی سے ختم کروا دی۔ اب وہ سہیلیاں نہیں، دشمن بن چکی تھیں۔ کلاس میں دو گروپ بن گئے تھے۔ ایک گروپ نادیہ کا اور دوسرا ہما کا۔ ہما تقریر بہت اچھی کرلیتی تھی جب کہ نادیہ تقریر لکھنے میں ماہر تھی۔ پہلے وہ دونوں مل کر کام کرتیں اب تو ایسی دشمن بن گئی تھیں کہ ایک دوسرے کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہ کرتیں۔ اسی طرح وہ نویں جماعت میں پہنچ گئیں۔

ایک دن ان کی ٹیچر نے انہیں سمجھایا کہ یہ اچھّی بات نہیں ہے۔ تم دونوں دوستی کرلو۔ وہ ٹیچر کے کہنے سے اس وقت تو گلے ملیں، مگر نفرتیں دور نہ کیں۔ ہما کی کوشش ہوتی کہ وہ کسی طرح فسٹ آجائے اور نادیہ کی کوشش ہوتی کہ وہ خود فسٹ آئے۔ کبھی نادیہ کی خواہش پوری ہو جاتی اور کبھی ہما کی۔

انہی دنوں ان کی کلاس میں ایک نئی لڑکی، عروج، داخل ہوئی۔ وہ ان کی دشمنی سے سخت نالاں تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح دونوں کی دوستی کروا دے۔ اس نے ان دونوں کے دلوں کی نفرت کو دور کیا اور انہیں پہلے جیسی سہیلیاں بنا دیا۔ دیکھا ساتھیو، نائلہ اور عروج دونوں ہی لڑکیاں تھیں، لیکن ایک نے نفرتیں پیدا کیں اور دوسری نے نفرتیں دور کیں۔ اب آپ سوچیں کہ آپ کو نائلہ جیسا بننا ہے یا عروج جیسا؟

(چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)۔

ببلو تم خفا کیوں ہو؟

عبدالحفیظ ظفر

کہا تھا تم سے یہ میں نے سبق پڑھو اپنا
نہ جانے بات مِری سُن کے تم خفا کیوں ہو؟
مِری کوئی بھی نصیحت تمہیں پسند نہیں
تمہارا پیار مرے دل میں پھر بھلا کیوں ہو؟
نہ جانے بات مِری سُن کے تم خفا کیوں ہو؟

میں چاہتا ہوں بُزرگوں کا تم کہا مانو
کبھی نہ دِل میں کسی کے لئے بُرا سوچو
یہ آرزو ہے، بنو تم خلوص[1] کے پیکر[2]
کسی کے واسطے نفرت سے دل بھرا کیوں ہو؟
نہ جانے بات مِری سُن کے تم خفا کیوں ہو؟

ہمیشہ سارا زمانہ تمہارے گُن گائے
جہاں ہو لفظ مَحبّت، تمہارا نام آئے
اگر وجود تمہارا ہو باعثِ رحمت
تمہارے واسطے پھر لب پہ بد دعا کیوں ہو؟
نہ جانے بات مِری سُن کے تم خفا کیوں ہو؟

(1) دوستی۔ سچائی (2) شکل و صورت

جگ مگاتی راہ

ایمیل کرالی چیوف
احفاظ الرحمٰن

"میرے بچّے، یہ ہے زلی ڈل کی وادی" دادا ابّا نے مجھ سے کہا "دیکھو، یہ کتنے نشیب میں ہے۔ یہاں ایک بہت بڑی لڑائی ہوئی تھی۔ عوام دُشمن فوجوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ اُن کی مشین گنیں، طوفان کی طرح، گرج رہی تھیں۔"

"دادا ابّا" میں نے پُوچھا "کیا آپ کے پاس بندوقیں نہیں تھیں؟"

"تھیں، لیکن گنتی کی تھیں۔ جو لوگ گاؤں سے آئے تھے، اُن کے پاس کُلہاڑیوں، درانتیوں اور لاٹھیوں کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک مشین گن تھی۔ اسپائرو نام کا ایک شخص، خندق میں لیٹا ہُوا، اُس مشین گن سے دشمن پر فائر کر رہا تھا۔ جب دشمن کا گھیرا تنگ ہو گیا تو اُس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم زلی ڈل کی وادی چھوڑ دیں ورنہ ہمیں چُن چُن کر قتل کر دیا جائے گا۔"

"اور یہ موڑ پر، سڑک کے اُوپر، جو بڑی سی چٹان نکلی ہوئی ہے، وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُسے لوگ الی موف کامک (بارہ سنگا چٹان) کہتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں، ایک دفعہ، پہاڑ پر بھیڑیوں کا ایک غول ایک بارہ سنگے کا پیچھا کر رہا تھا۔ بارہ سنگا برف پر سے گزرتا ہوا اُس چٹان کی طرف بھاگا۔ خوں خوار بھیڑیے اُس کے پیچھے لگے رہے۔ خوف زدہ بارہ سنگا جب سب سے اونچی چٹان پر پہنچا تو ایک لمحے کے لئے رُک کر نیچے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے بھیڑیوں کے غول کی طرف دیکھا، جو سر پر آ پہنچا تھا۔ اس نے ایک دم چھلانگ لگائی، مگر وہ نیچے کھڈ میں نہیں گرا بلکہ پرندے کی طرح اُڑتا ہوا سیدھا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔"

"بھیڑیوں کا کیا ہُوا؟" میں نے پوچھا۔

دادا ابّو بولے "وہ اندھوں کی طرح بارہ سنگے کے پیچھے دوڑتے رہے اور آخر گہرے کھڈ میں گر گئے۔ اُن کی گردنیں ٹوٹ گئیں۔ بارہ سنگے نے تو اپنی جان بچالی تھی، لیکن متیچو نے اپنی جان بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ

انہی عوام دشمن فوجیوں کے ہاتھوں مرا تھا۔ تمہیں سامنے، اُن پودوں کے پیچھے، سنگِ مرمر کی بڑی سی تختی نظر آرہی ہے؟"

"جی ہاں" میں نے کہا "میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ اِس وقت تو مزار کی تختی ہے" دادا ابّا بولے "لیکن 25 سال پہلے یہ پتھرالی موف کامک کے پیچھے موڑ پر لگا ہوا تھا۔ اِسی کے پیچھے میتیجو اپنی مشین گن لے کر بیٹھ گیا آؤ، اُس کی قبر کی طرف چلیں۔"

ہم نے نیچے گہری گھاٹی سے گزر کر پہاڑی چشمے کو پار کیا اور دوسرے کنارے پر آگئے۔ تھوڑی دیر درختوں کے نیچے چلتے رہے، اور پھر تختی کے پاس پہنچ گئے۔ تختی کے اوپر ایک ستارہ بنا ہوا تھا اور اُس کے نیچے لکھا تھا:

میتیجو گردانوف

عمر 12 سال

اِس نے 12 ستمبر 1923ء کو اپنے ملک کی آزادی کے لئے جان دے دی۔

تختی کے گرد ایک ہار لپٹا ہوا تھا۔ اُس کے اوپر پھولوں کی بیل تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک پتّا تک نہیں ہِل رہا تھا۔ دادا ابّا نے اپنا ہیٹ اُتارتے ہوئے آہستہ سے کہا:

"یہاں ہمارا نجات دہندہ میتیجو سو رہا ہے۔ وہ ایک لوہار، 'گردان' کا بیٹا تھا، اور صحیح معنوں میں بہادر اور وطن دوست لڑکا تھا۔ جب دُشمن نے ہمیں وادی چھوڑنے کا حکم دیا تو ہمارے بٹالین کمانڈر نے گرج دار آواز میں کہا:

"اگر دُشمن زلی ڈل کی وادی پر قابض ہوگئے تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ اسپائرو یہاں بیٹھ کر اپنی مشین گن سے اُس وقت تک دُشمن کو روکے رکھے گا، جب تک کہ ہمارا دستہ جنگل میں نہیں پہنچ جاتا۔ اسپائرو کہاں ہے؟ جاؤ، مشین گن چلانے والے اسپائرو کو بُلا کر لاؤ۔"

"وہ ہلاک ہوچکا ہے، کمانڈر" ایک شخص نے بتایا۔

کمانڈر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس نے پوچھا "کیا تم میں

سے ایسا کوئی شخص نہیں جو مشین گن چلا سکے؟"

"میں ہُوں" ایک باریک سی آواز سُنائی دی اور اُسی وقت میتیجو لوگوں کے ہجوم میں سے نکل کر کمانڈر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ سب کی نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ مجھے اب تک وہ منظر یاد ہے۔ وہ تمہارے برابر ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ اُس کے بال سُنہری تھے، قمیص کھدر کی تھی اور نیکر گھٹنوں تک لٹکا ہوا تھا۔ جب وہ ہماری بٹالین میں شامل ہوا تھا تو ہم نے اُسے مُنہ نہیں لگایا تھا۔ آزادی کی جنگ کے پہلے دِن جب وہ آیا تو کمانڈر نے اسے گھر جانے کا حکم دیا، لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ گردان لوہار کا بیٹا ہے جو جیل میں ہے تو اُس نے اُسے اپنے دستے میں شامل کرلیا۔

"تم کو مشین گن چلانی کس نے سکھائی؟" کمانڈر نے میتیجو سے پوچھا۔

"میرے باپ نے۔ پچھلے سال کچھ لوگ ہماری دُکان

میں ایک پُرانی مشین گن مَرمّت کے لئے لائے تھے۔ میں اور میرے ابّا' خفیہ طور پر' اُس کی مَرمّت کرتے رہے۔ ہم نے تین دفعہ اسے جنگل میں چلا کر بھی دیکھا۔ پھر دشمنوں نے میرے ابّا کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔ میں چچا اسپائرو کی طرح نشانہ لگا سکتا ہوں اور دستی بم بھی پھینک سکتا ہوں۔"

کمانڈر نے کہا "تم مشین گن چلا سکتے ہو تو موڑ پر پتّھر کے پیچھے' بیٹھ جاؤ اور دشمن کو اُس وقت تک روکے رکھو جب تک کہ ہمارے دستے یہاں سے بہُت دُور نہیں پہنچ جاتے۔ اِس کے بعد تم جنگل میں بھاگ جانا۔"

ہم نے مشین گن پتّھر کے پیچھے لگادی اور متیجو کو گولیوں کا ایک ڈبّا اور تین دستی بم دے کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں متیجو کی مشین گن کی آواز سنائی دی۔ ہم نے سوچا' اب دشمن الی موف کالمک کے قریب پہنچ گئے ہیں اور متیجو اپنی مشین گن سے انہیں جہنّم رسید کررہا ہے۔

بعد میں ایک گڈریے نے جو لڑائی کے وقت پہاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا' مجھے بتایا کہ وہ لڑکا پتّھر کی اوٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب دشمن کی فوج کا پہلا دستہ نمودار ہوا تو وہ فائر کرنے لگا۔ اُس کی مشین گن طوفان کی طرح گرجنے لگی۔ پہلا آدمی ہلاک ہوگیا اور دوسرے دو زخمی ہوگئے۔ باقی کے اوسان خطا ہوگئے۔ ایک افسر نے اپنی تلوار کھینچی اور ہوا میں لہراتا ہوا پتّھر کی طرف بڑھا۔ لیکن مشین گن نے اسے بھی ٹھنڈا کردیا۔ مجھے اُن کی صحیح تعداد یاد نہیں' بس اتنا معلوم ہوا کہ پوری وادی دشمن کے سپاہیوں سے بھری ہوئی تھی اور اُس لڑکے نے اُنہیں آخر تک روکے رکھا۔ وہ

ایک گھنٹے تک اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتا رہا۔ ہمارے دستے اِس دوران میں زلی ڈل سے جاچکے تھے۔

اور پھر تین فوجی گاڑیاں گڑگڑاتی ہوئی پتّھر کی طرف بڑھنے لگیں۔ میتیچو نے اپنے دستی بموں سے اُن کا اِستقبال کیا۔ بم کے پھٹتے ہی پہلی گاڑی اُلٹ کر نیچے گھاٹی میں گری۔ یہ دیکھ کر باقی دونوں گاڑیاں پیچھے ہٹنے لگیں۔ آخر میتیچو کی مشین گن کی گولیاں ختم ہوگئیں اور وہ خاموش ہوگئی۔ دشمن پھر آگے بڑھنے لگا۔ لڑکے نے گولیوں کا خالی ڈبّا اٹھا کر دور پھینک دیا اور پیچھے پلٹ کر نیچے گھاٹی میں اُترنے لگا۔ وہ چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا پودوں کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ عوام دشمن سپاہیوں نے اُس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک گولی اُس کے جسم میں لگی اور وہ پودوں کے درمیان گر گیا۔

اس طرح میتیچو گردانوف کی زندگی ختم ہوگئی۔ اس نے اِسی جگہ ہمارے ایک فوجی دستے کی جان بچائی تھی۔ اگلے دن ہم سرحد کے دوسری طرف نکل گئے۔"

دادا ابّا نے اپنا کھُردرا ہاتھ اٹھایا اور بڑی دیر تک قبر کی تختی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

"یہ ہار کس نے ڈالا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے اِسکول کے طالِب عِلموں نے۔ اُنہوں نے اِس پہاڑ پر اپنا کیمپ لگایا تھا۔ اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ اُن کے کیمپ کا نام بھی میتیچو گردانوف کے نام پر رکھا گیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو، لوگوں نے میتیچو کی قبر کی طرف جانے والے راستے کو کتنا سجا رکھا ہے۔ یہ راہ اُس وقت تک جگ مگاتی رہے گی، جب تک بلغاریہ کے عوام زندہ ہیں۔ میرے الفاظ یاد رکھنا، پیارے لڑکے۔"

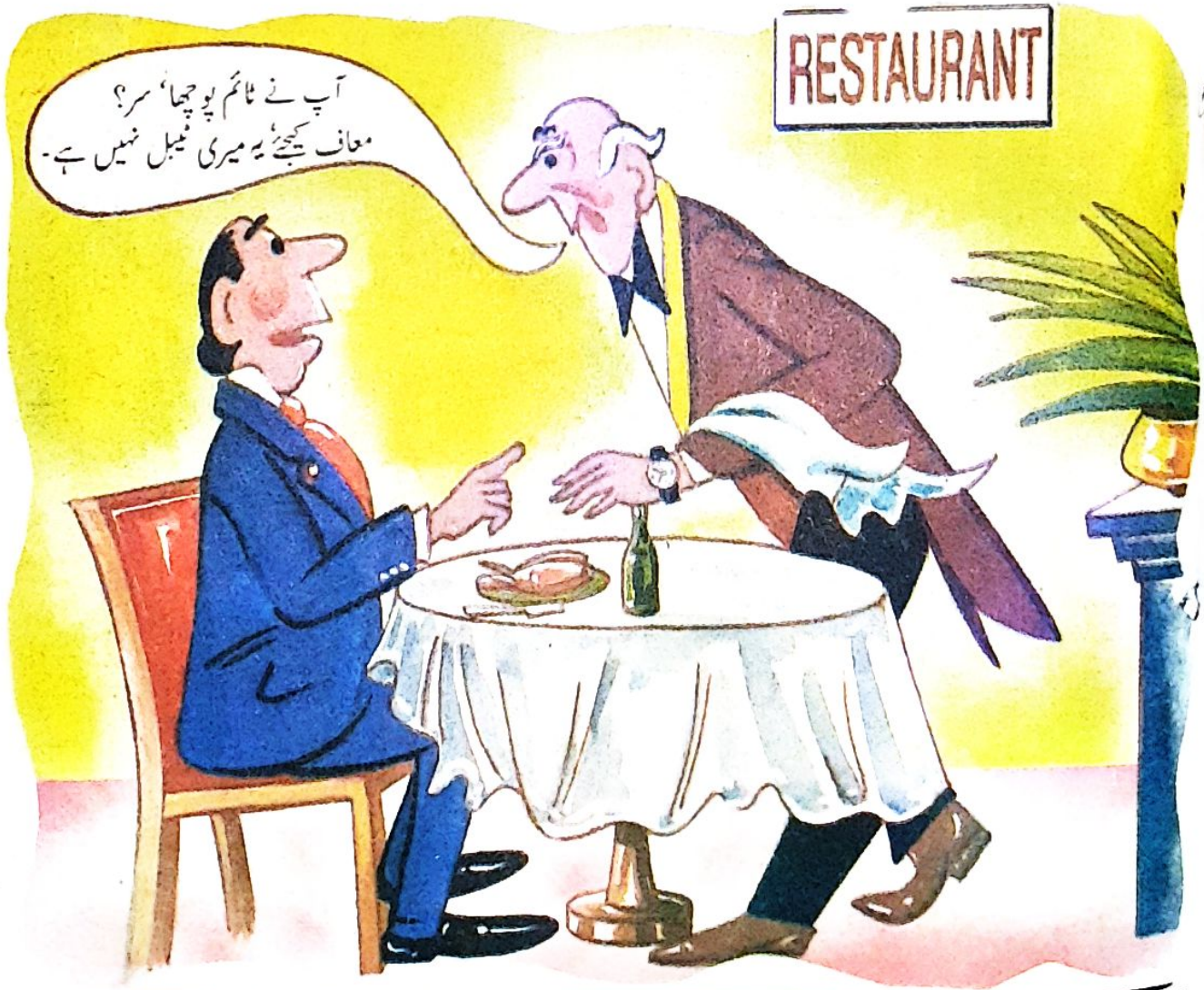

مگرمچھ

مگرمچھ ایک رینگنے والا دریائی جانور ہے۔ اس کی 15 قسمیں ہیں جو 20 کروڑ سال سے ہماری زمین پر رہ رہی ہیں۔ اتنا لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود ان کی شکل و صورت اور رہن سہن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔

یہ بھدا اور ڈراؤنا جانور خشکی پر گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے، مگر پانی میں بڑی تیزی سے تیرتا ہے۔ گوشت خور جانور ہے۔ زیادہ تر مچھلیاں اور مینڈک وغیرہ کھاتا ہے۔ بڑے مگر مچھ بڑے جانوروں کو بھی گھسیٹ کر پانی میں لے جاتے ہیں، اور انسان پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

مگر مچھ افریقہ، ایشیا، آسٹریلیا اور امریکا کے گرم مرطوب علاقوں کے دریاؤں اور دلدلوں میں پائے جاتے ہیں، اور عام طور پر 10 فٹ سے 12 فٹ تک لمبے ہوتے ہیں۔ البتہ امریکی مگرمچھ کی لمبائی 23 فٹ تک ہوتی ہے۔

دوسرے رینگنے والے جانوروں کی طرح مگرمچھ بھی اپنے جسم کی حرارت کو باقاعدہ نہیں کر سکتے۔ تیز دھوپ میں ان کا جسم بہت گرم ہو جاتا ہے، اور چوں کہ انہیں پسینا نہیں آتا، جس سے ان کا جسم ٹھنڈا ہو سکے، اس لئے اپنے جسم کی گرمی نکالنے کے لئے دریا کے کنارے، منہ کھول کر، لیٹ جاتے ہیں۔ اس طرح، تبخیر کے عمل سے، ان کے جسم کی حرارت باہر نکلتی رہتی ہے۔

اگر موسم ٹھنڈا ہو تو مگرمچھ کا جسم بھی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے جسم کو گرم کرنے کے لئے کانپ نہیں سکتا۔ (ہمیں سردی لگے تو ہم کانپنے لگتے ہیں اور کپ کپاہٹ سے ہمارا جسم گرم ہو جاتا ہے)۔ اس کے علاوہ اس کے جسم کے کھپرے یا چھلکے، پرندوں کے بالوں اور پروں کی طرح اس کے جسم میں حرارت کو جمع نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ جانور گرم علاقوں میں رہتا ہے۔

مگرمچھ صبح سویرے، پانی میں سے نکل کر، کنارے پر آجاتے ہیں، جہاں وہ دھوپ میں اپنے جسم کو گرم کرتے ہیں۔ لیکن دوپہر کا سورج ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ دوپہر کو وہ، اپنے جسم کو ٹھنڈا کرنے کے لئے، پانی میں چلے جاتے ہیں یا کسی چٹان یا درخت کے سائے میں پناہ لیتے

ہیں۔ سہ پہر کو وہ پھر دھوپ سینکتے ہیں۔ اِس کے بعد پانی میں چلے جاتے ہیں، کیوں کہ رات کو پانی اِتنی جلد ٹھنڈا نہیں ہوتا جتنی جلد باہر کی ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے۔

آپ مگرمچھ کو پانی میں تیرتا ہُوا دیکھیں گے تو یوں لگے گا جیسے درخت کا کوئی تنا تیر رہا ہے۔ تیرتے وقت اس کی نکھیں اور نتھنے پانی کی سطح کے اوپر ہوتے ہیں اور نچلا جبڑا پانی کے اندر ہوتا ہے۔

مگرمچھ کی تھوتھنی لمبی، جبڑے چوڑے اور پیٹھ پر، قطار در قطار، ہڈّیوں کے پترے ہوتے ہیں۔ بعض مگرمچھوں کی مادائیں کیچڑ اور گھاس پھونس سے گھونسلا بناتی ہیں اور اُس کے اندر انڈے دیتی ہیں جو 15 سے 20 تک ہوتے ہیں۔ پرندوں کی طرح مادہ مگرمچھ انڈوں پر نہیں بیٹھتی۔ اُنہیں سورج کی گرمی یا گلے سڑے پودوں میں سے نکلنے والی حرارت سیتی ہے۔ بچّے شروع میں کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں۔ اِس کے بعد جُوں جُوں بڑھتے ہیں، مچھلیاں، مینڈک اور دوسرے چھوٹے موٹے جانور کھانے لگتے ہیں۔ بچّے بہُت تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ایک سال میں ان کا جِسم 25 سینٹی میٹر بڑھ جاتا ہے۔

مگرمچھ پانی میں چھُپ کر اپنے شکار کا اِنتظار کرتے ہیں۔ جُوں ہی کوئی جانور دریا پر پانی پینے آتا ہے، وہ اُس کی ٹانگ پکڑ لیتے ہیں اور پھر گھسیٹ کر پانی کے اندر لے جاتے ہیں۔ یہاں وہ اس کے سر پر اپنا سر یا دُم مار کر اسے بے ہوش کر دیتے ہیں۔ جانور ڈوب کر مرجاتا ہے۔ مگرمچھ کے دانت اِتنے مضبوط نہیں ہوتے کہ وہ اپنے شکار کو چیر پھاڑ سکے۔ اس لئے وہ اسے کچھ عرصہ پانی میں پڑا رہنے دیتا ہے، اور جب وہ گل سڑ جاتا ہے تو پھر اُسے کھاتا ہے۔ وہ شکار کو کھانے سے پہلے بہت سی کنکریاں نِگل لیتا ہے۔ یہ کنکریاں شکار کے گوشت کو کُچلتی اور پیستی ہیں۔

مگرمچھ کی کھال بہُت قیمتی ہوتی ہے۔ شکاری اس کی کھال بیچ کر خوب پیسے کماتے ہیں۔ اس سے ہینڈ بیگ اور دوسری قیمتی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

گھڑیال مگرمچھ کے خاندان کا ایک جانور ہے اور بھارت کے دریاؤں میں پایا جاتا ہے۔ اِس کی تھوتنی مگرمچھ کی تھوتھنی سے زیادہ لمبی ہوتی ہے، مگر زیادہ مضبوط نہیں ہوتی۔ اِس لئے یہ جانور صِرف مچھلیاں اور مینڈک کھاتا ہے، بڑا جانور نہیں پکڑ سکتا اور نہ اِنسان پر حملہ کرتا ہے۔ مادہ گھڑیال ریت میں سوراخ کرکے گھونسلا بناتی ہے اور اُس کے اندر انڈے دیتی ہے۔ جوان گھڑیال 6 میٹر تک لمبا ہوتا ہے۔ یہ جانور زیادہ وقت پانی میں گزارتے ہیں۔ (س۔ل)

فرصت کے کھیل

کاغذ کے پھول

پھول گھر کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ قدرتی پھولوں کا گُل دستہ دو تین روز بعد مُرجھا جاتا ہے، لیکن کاغذ کے رنگ برنگے پھول کمرے میں سجا دیئے جائیں تو یہ کافی عرصہ خراب نہیں ہوتے۔ کاغذ کے پھول بنانے کے لئے آپ کو ان چیزوں کی ضرورت ہوگی: رنگین ٹشو پیپر، کریپ پیپر (سبز)، پتنگ کا کاغذ (سبز)، لوہے کا لمبا تار، پینٹ (پیلا)۔

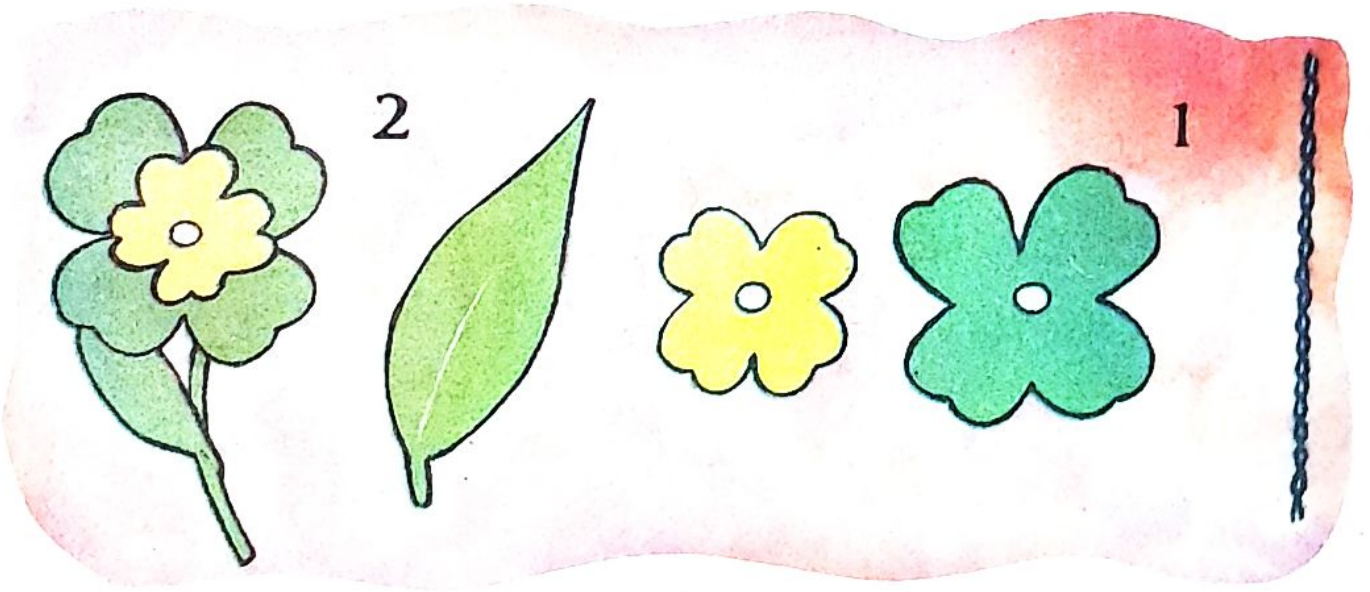

بارہ انچ لمبا لوہے کا تار لیں اور اسے درمیان سے موڑ کر اور بل دے کر دوہرا کرلیں۔ اب پنسل سے خاکہ نمبر1 اور خاکہ نمبر2 ٹشو پیپر پر بنائیں اور کاٹ لیں۔ پہلے بڑے خاکے کو تار کے ایک سرے میں پرو دیں اور بعد میں چھوٹے خاکے کو اس کے اُوپر پرو دیں۔

اب سبز رنگ کے کریپ پیپر پر پتے کا خاکہ بنا کر کاٹ لیں اور اسے پھول کے نیچے دھاگے سے تار کے ساتھ باندھ دیں۔ پھر پورے تار پر سبز رنگ کا پتنگ کا کاغذ چپکا دیں۔ آخر میں تار کے اوپر کے سرے پر پیلا پینٹ کر دیں۔ اِسی طریقے سے آپ مختلف رنگوں کے بہت سے پھول گل دان میں سجا سکتے ہیں۔

قدرتی پھول

آپ اپنے کمرے میں قدرتی پھول بھی آسانی سے اُگا سکتے ہیں۔ اِس کے لئے آپ کو اِن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ یوگرٹ (دہی) کا خالی گلاس یا چھوٹا گملا، مٹّی، گلے سڑے پتّوں کی باریک کھاد، بیج اور پانی۔

گلاس یا گملے کے پیندے میں چھوٹا سا سوراخ کریں۔ اُس میں اچھی باریک مٹی ڈالیں۔ مٹی کی اوپر کی سطح ہموار رہے۔ پھر، موسم کے مطابق، وہ بیج لیں جو آپ اُگانا چاہتے ہیں۔ تھوڑے سے بیج مٹّی کی ہموار سطح پر بکھیر دیں۔ اِس کے بعد گلے سڑے پتّوں کی کھاد سے بیجوں کو ڈھانپ دیں۔ کھاد کی تہ زیادہ موٹی نہ ہو۔ اب فوارے سے اِس طرح پانی چھڑکیں کہ بیج ننگے نہ ہوجائیں۔ پھر کھڑکی میں رکھ دیں، اور روزانہ پانی چھڑکتے رہیں۔ چند روز بعد گملے میں ننھے ننھے پودے نکلنے لگیں گے۔

R. L. No. 4756 The Taleem-o-Tar›iat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 1

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

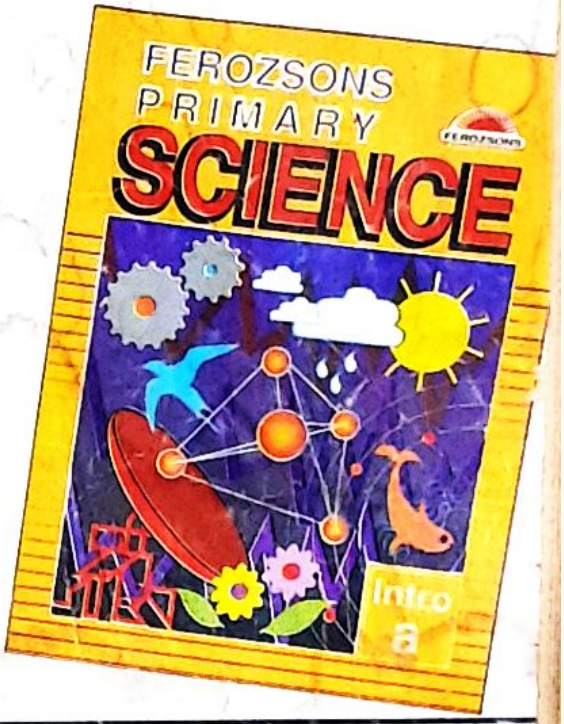

F…ZSONS PRIMARY SCIENCE is a complete series of twelve syst… tically graded books, well suited to the educational needs of chil…en in English Medium Schools worldwide.
The aim of this series is to present the fundamentals of science in a way which children can easily understand and assimilate. They will not only remember the facts but also remember that the learning of them was a joyful experience.
Each book is divided into a number of parts which cover the main areas of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has been specially chosen to complement and support the text.
Each book commences with an interest-stimulating quiz and ends with an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

Intro a — 969 … 10141 2 — …35.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Objects

1a — 969 0 10092 0 — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Things around us
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Animals and their babies

2a — 969 0 10094 7 — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Health and safety
Part 3 Animals
Part 4 More about anima…
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism

Intro b — 969 0 10142 0 — Rs …5.00
Part 1 Plants
Part 2 Food
Part 3 Light and Heat
Part 4 Movement
Part 5 Distance
Part 6 Earth and Sky
Part 7 Time

1b — 969 0 10093 9 — Rs. 40.00
Part 1 Objects
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
Part 7 Heat and temperature
Part 8 Light and shadow
Part 9 Time

2b — 969 0 10095 5 — Rs. 40.00
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Force and machin…
Part 4 Energy
Part 5 Electricity
Part 6 Material and matte…
Part 7 Time

3a — 969 0 …0096 … — Rs. …00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
Part 5 Magnetism
Part 6 More about animals

4a — 969 0 10098 X — Rs. 40.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living things and their needs
Part 4 Living things protect themselves
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism

5a — 969 0 10100 5 — Rs. 50.00
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safe…
Part 3 Animals
Part 4 Sound

3b — 969 0 10097 1 — Rs. 40.00
Part 1 Light and colour
Part 2 Plants
Part 3 Heat energy
Part 4 Light energy
Part 5 Force and energy
Part 6 Materials and matter
Part 7 Earth and atmosphere
Part 8 Time

4b — 969 0 10099 8 — Rs. 40.00
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Heat and temperature
Part 4 Electricity
Part 5 Time

5b — 969 0 10101 3 — Rs. 50.00
Part 1 Plants
Part 2 Animals
Part 3 Force and motion
Part 4 Heat and electricity
Part 5 Matter
Part 6 Earth and atmosphe…
Part 7 Time

(Prices are subject to change without notice)

Also under publication: Available in 1994

Ferozsons Primary English
Ferozsons Primary Mathematics
Ferozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD
LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 6301196–98 Fax: 627…
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 5…
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi
Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534